ENLIGHTEN PUBLICATIONS

قرآن مجید

اور ہماری شخصیت

محمد مبشر نذیر

حافظ محمد شارق

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ

قرآن مجید اور ہماری شخصیت

مصنّفین

محمد مبشر نذیر

حافظ محمد شارق

ا

کتاب	:	قرآن مجید اور ہماری شخصیت
مصنفین	:	محمد مبشر نذیر/حافظ محمد شارق
سالِ اشاعت	:	2014،اشاعت دوم 2024
ناشر	:	ادارہ تحقیقاتِ مذاہب
تعداد	:	ایک ہزار
رابطہ	:	hmshariqofficial@gmail.com 0347-2005680

انتساب

کلامِ الٰہی سے محبت کرنے والوں کے نام

فہرست

تعارف

قرآن مجید اللہ تعالی کی جانب سے انسانیت کو دی جانے والی ہدایت کی آخری کتاب ہے۔ قرآن کا پیغام صرف اور صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو کھلی دعوت ہے کہ وہ اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ یہ ایک غیر معمولی کتاب ہے جس کی مدد سے پچھلی چودہ صدیوں میں اربوں کی تعداد میں انسان اپنے لئے رہنمائی حاصل کرتے رہے ہیں۔ یہ دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جسے بلامبالغہ کروڑوں کی تعداد میں لوگ زبانی یاد رکھتے ہیں۔ یہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔اربوں لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس کتاب کا مصنف کوئی انسان نہیں بلکہ وہ ہستی ہے جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ قدیم لٹریچر کی دوسری کتب کے برعکس اس کتاب کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس کی حفاظت کا غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔ یہ کتاب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی اور اس کے نزول کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تحریر کروانا شروع کر دیا۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ اسے مکمل یا جزوی طور پر یاد کرنے کا اہتمام کرنے لگے۔ تئیس برس کے عرصے میں اس کا نزول مکمل ہوا تو اللہ تعالی کے احکامات کے مطابق اسے ترتیب دے کر ایک جلد کی صورت میں محفوظ کر دیا گیا۔

چند ہی برسوں میں اس کے حفاظ کی تعداد ہزاروں میں پہنچ گئی۔اس دور میں جب ابھی

پریس ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب کے ہزاروں نسخے کاپی کر کے پوری دنیا میں پھیلا دیے گئے۔ اس کتاب کو لکھنے کے لئے بہت سے لوگوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور فن کتابت کو اس کے عروج پر پہنچا دیا۔ نہ صرف لکھنے بلکہ اسے یاد کرنے، اس کی تعلیم دینے اور اس پر تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد بھی لاکھوں میں پہنچ گئی اور لوگوں نے اس کتاب کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ آج بھی دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بغیر کسی مبالغے کے لاکھوں میں ہو گی جو اپنی زندگیاں اس کتاب کی تعلیم کے لئے وقف کر چکے ہیں۔

قرآن مجید کا اس حیثیت سے مطالعہ ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ یہ ہدایت اور رہنمائی کی کتاب ہے۔ زیر نظر کتاب قرآن مجید کی تفسیر نہیں ہے۔ یہ اپنی شخصیت کو بہتر بنانے کے لئے قرآن مجید کا مطالعہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی شخصیت کو ویسا بنانے کی کوشش کریں جیسا کہ قرآن بنانا چاہتا ہے۔ پورے قرآن کا موضوع ہی تزکیہ نفس یعنی تعمیر شخصیت ہے۔ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کی اس کاوش میں ہم نمونے کے طور پر قرآن مجید کی منتخب آیات کا مطالعہ کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ نسل انسانیت کو یہ کتاب کیا پیغام دیتی ہے اور قرآن کا آئیڈیل انسان کیسا ہوتا ہے؟

یہ تحریر صرف ان لوگوں کے لئے خاص نہیں ہے جو قرآن پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے لئے بھی مفید ہے جو اگرچہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے لیکن اس کے پیغام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہوں یا نہ ہوں لیکن اگر آپ ایک دیانتدار شخص ہیں تو اس

کتاب کے غیر معمولی ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔ یہ تحریر قرآن مجید کے ان اثرات کو بیان کرتی ہے جو وہ انسانی شخصیت پر مرتب کرتا ہے۔ اس کے مطالعے سے آپ یہ جان سکتے ہیں کہ قرآن پر عمل کرنے والے انسان کی سیرت کیسی ہونی چاہیے۔

انسان کی شخصیت اس کے خیالات و نظریات، رویے اور عمل پر مشتمل ہوتی ہے۔ قرآن مجید انسانی شخصیت کے ان تینوں پہلوؤں کو اپنا ہدف بنا کر انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس خاص سانچے کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو اس کا عنوان ہو گا "اخلاقیات"۔ قرآن مجید انسان کے نظریات، رویوں اور عملی کردار کو اخلاقیات کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور اس کی شخصیت کو ایک اعلیٰ اخلاقی وجود عطا کر کے اسے عملی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ سب کیسے ہوتا ہے، اس کا مطالعہ ہم تحریر کے اسی سلسلے میں کریں گے۔ اس ضمن میں انشاءاللہ روزانہ چند آیات لے کر ان کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اس کتاب میں ہم نے صرف سورۃ البقرۃ سے آیات کا انتخاب کیا ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ روزانہ چند منٹ نکال کر اس مطالعے کو جاری رکھیں اور اس سلسلے میں اپنے تاثرات، مشاہدات اور تجربات سے بھی ہمیں آگاہ کرتے رہیں۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ زیرِ نظر کتاب ابتداءً میرے استاد محترم محمد مبشر نذیر صاحب کی تصنیف ہے۔ تاہم اس کی ترتیب، تحریرِ نو، اور تقریباً نصف سورت کے بعد آخر تک اس کی تکمیل ، نیز درمیان میں بعض آیات کے اضافے کا کام راقم الحروف نے کیا ہے۔ بعض جگہوں پر راقم کو

استاد محترم سے اختلاف بھی ہے لیکن احترام کے تقاضے سے اسے حذف نہیں کیا۔ان اختلافات کا اظہار کسی اور موقع پر کیا جاسکتا ہے۔ہر انسانی کاوش کی طرح اس میں بھی سہو و خطا کا بہر حال امکان موجود ہے۔اہل علم سے قوی امید ہے کہ وہ اس کاوش کو سراہیں گے اور جہاں کہیں اصلاح و ترمیم کی گنجائش ہو اس بارے میں مجھے مطلع کریں گے۔خدا تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

حافظ محمد شارقؔ

14 نومبر 2014

جمعۃ المبارک۔20 محرم الحرام 1436ھ

اللہ کے نام سے۔۔۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

اللہ کے نام سے شروع جو رحمٰن اور رحیم ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم" کو تسمیہ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں سورہ النمل میں تسمیہ بطور آیت وارد ہوا ہے، اس لحاظ سے یہ قرآن پاک کا ایک مبارک حصہ بھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ تمام شریعتوں میں یہ بات محبوب اور آدابِ خداوندی میں شامل رہی ہے کہ ہر جائز کام شروع کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کا نام لیا جائے۔ انسانی سماج میں بھی یہ بات عام ہے کہ کسی اچھے کام کا آغاز کرتے ہوئے ایسی ہستی کو ضرور یاد رکھا جاتا ہے جس سے اسے بہت زیادہ عقیدت و محبت ہو۔ چنانچہ ہر اچھے کام کا آغاز خدائے واحد کا نام لے کر کرنا اور اسے خدا سے منسوب کرنا بھی دراصل انسان کے لیے خدا سے اس کی محبت و عقیدت کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہم قرآن میں بھی دیکھتے ہیں تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنے ہر کام کا آغاز بسم اللہ سے ہی کرتے رہے ہیں۔ جب سیدنا نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے تو اللہ کا نام لے کر سوار ہوئے۔ حضرت سلیمان نے بھی جب ملکۂ سبا کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو اپنے دعوتنامہ کا اس جملہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے ساتھ آغاز کیا۔ حتیٰ کہ خدا کے آخری کلام قرآن مجید کے آغازِ نزول میں بھی وہی کلمات وارد ہوئے جو تسمیہ

کے نوعیت کے تھے۔یعنی ''اپنے رب کے نام سے پڑھیے۔!''

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ تسمیہ عہد نامہ قدیم میں خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا بھی مصداق ہے جو بنی اسرائیل کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی وساطت دی گئی۔ بائبل کی کتابِ استثناء (18:18-19) میں یہ بشارت اس طرح بیان کی گئی ہے "میں ان کے لیے انھی کے بھائیوں میں سے تیری طرح ایک رسول بھیجوں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہ وہی کچھ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں ان سے اس کا حساب لوں گا"۔

تسمیہ کے الفاظ میں خدا تعالیٰ کی دو خاص صفات رحمٰن اور رحیم بھی آئی ہے۔ یہ صفات اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے ساتھ انتہائی مہربانی، شفقت، رحم، نرم دلی اور سخاوت اور بخشش کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا، ان میں تقاضے پیدا کیے اور پھر ان تقاضوں کو انتہائی خوبی کے ساتھ پورا کرتے ہوئے اپنی رحمت، لطف اور کرم نوازی کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ مخلوق پر محبت اور شفقت نچھاور کرتا ہے تو ساتھ ہی بندہ جب مشکل میں گرفتار ہوتا تو وہ اسے اپنی پناہ میں لے کر اس کی مدد کرتا ہے اور گھٹاٹوپ اندھیروں میں ہدایت کا نور بن جاتا ہے۔ یہی لطف و کرم اللہ کا پہلا تعارف ہے جو انسان کو اس کے سامنے جھکاتا، اس کا احسان مند بناتا اور اسے شکر پر مجبور کرتا ہے۔

اپنی حقیقت کے اعتبار سے تسمیہ ایک دعا ہے جس کے ذریعے انسان ہر قابل ذکر کام شروع کرنے سے قبل خدا کے حضور اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ آغاز وحی میں ہی اللہ تعالیٰ نے بسم اللہ پڑھنے کا

حکم دے دیا۔ مولانا فراہی کے الفاظ میں تسمیہ دراصل عظیم الشان معارف کا گنجینہ ہے۔تاہم ہماری فہم میں بطور دعا تسمیہ کی بنیادی اہمیت دو ہیں۔اول خلوصِ نیت اور دوم معیت الٰہی کا شعور۔

اول الذکر حکمت کا تقاضا ہے کہ بندہ ہر کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کرے تاکہ اس کی نیت اس بارے میں بالکل پاکیزہ ہو جائے کہ اس کام کا اصل مقصد صرف اللہ کی رضا کو حصول ہے اور اس کو راضی کرنے کے سوا اس عمل کا کوئی مقصد نہیں۔اس کام میں کوئی دنیاوی پہلو شامل ہے تو بھی اس کا مقصود خدا کی رضا حاصل کرنا ہو تاکہ اس کا فعل آخرت کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو۔اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ کام جو اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے بے نتیجہ ہے۔(مسند احمد)

جبکہ دوسری حکمت یعنی معیت الٰہی کا شعور انسان کے کردار واخلاق اور روحانی ومعاشرتی زندگی کی ہر سطح پر اثرانداز ہوتا ہے۔جب بندہ اپنے کام سے پہلے خدا کا نام لیتا ہے تو اسے یہ یاددہانی ہو جاتی ہے کہ وہ جو بھی کام کرنے جارہا ہے اس میں خدا کی نافرمانی کو کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔رحمٰن ورحیم کی صفت اسے متنبہ کرتی ہے کہ خدائے رحمان ورحیم کا نام لے کر جس کام کا آغاز کر رہا ہے وہ کسی کے لیے ادنٰی درجے کی بھی تکلیف کا سبب نہ بنے۔علاوہ ازیں انسان جب اپنے کام کا آغاز خدا کے نام سے کرتا ہے تو اس کے قلب و باطن پر یہ احساس غالب رہتا ہے کہ اللہ کی مدد اس کے کام میں شامل حال ہے۔بندے کو احساس رہتا ہے کہ اسے اللہ کی رحمت اور مدد میں میسر ہے۔یہ بات انسان کے حوصلے بلند کرنے کا ضامن ہے۔

اللہ کی محبت و شفقت

قرآن مجید کی ابتدا "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کے جملے سے ہوتی ہے۔اس کا ترجمہ ہے، "اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان ہے اور اس کی شفقت ہمیشہ رہنے والی ہے۔" اس مختصر سے جملے کو کسی بھی خدا پرست انسان کی شخصیت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ایسا انسان جو خدا پر یقین رکھتا ہے، اس کا ہر کام خدا کے نام سے ہی شروع ہونا چاہیے۔

انسان جب کوئی کام شروع کرتا ہے تو وہ ایسا کسی سہارے کی بنیاد پر کر رہا ہوتا ہے۔ یہ سہارا انسان کی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں بھی ہو سکتی ہیں، اس کا مال و دولت بھی ہو سکتا ہے، اس کے دوست اور ساتھی بھی ہو سکتے ہیں اور اس کے گرد و پیش میں موافق حالات بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید انسان کو یہ درس دیتا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں پر تکیہ کرنے کی بجائے صرف اور صرف اپنے رب کے سہارے پر کام کا آغاز کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کے بغیر شروع کیے جانے والے کام کو برکت سے خالی قرار دیا ہے۔

قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اور اس کا بنیادی مقصد انسان کو اپنے رب کے حضور جواب دہی کے لئے تیار کرنا ہے اس لئے اس کا آغاز اللہ کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے نام کی اتھارٹی کے ساتھ پیش کی ہے۔

بسم اللہ سے ہر کام کے آغاز کی کچھ مزید حکمتیں بھی ہیں۔ بندہ ہر کام کی ابتداء اللہ کے نام سے

کرے تاکہ اس کی نیت اس بارے میں بالکل پاکیزہ ہو جائے کہ اس کام کا اصل مقصد صرف اللہ کی رضا کو حصول ہے اور اس کو راضی کرنے کے سوا اس عمل کا کوئی مقصد نہیں۔اس کام میں کوئی دنیاوی پہلو شامل ہے تو بھی اس کا مقصود خدا کی رضا حاصل کرنا ہو تاکہ اس کا فعل آخرت کے اعتبار سے نتیجہ خیز ہو۔اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر وہ کام جو اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے بے نتیجہ ہے۔(مسند احمد)

جبکہ دوسری حکمت یعنی معیت الٰہی کا شعور انسان کے کردار واخلاق اور روحانی و معاشرتی زندگی کی ہر سطح پر اثر انداز ہوتا ہے۔جب بندہ اپنے کام سے پہلے خدا کا نام لیتا ہے تو اسے یہ یاد دہانی ہو جاتی ہے کہ وہ جو بھی کام کرنے جا رہا ہے اس میں خدا کی نافرمانی کو کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں انسان جب اپنے کام کا آغاز خدا کے نام سے کرتا ہے تو اس کے قلب و باطن پر یہ احساس غالب رہتا ہے کہ اللہ کی مدد اس کے کام میں شامل حال ہے۔بندے کو احساس رہتا ہے کہ اسے اللہ کی رحمت اور مدد میں میسر ہے۔یہ بات انسان کے حوصلے بلند کرنے کا ضامن ہے۔

اس جملے میں اللہ کی ایک خاص صفت پر زور دیا گیا ہے اور وہ ہے رحمت اور شفقت۔اس رحمت کا ایک پہلو اس کا جوش اور ولولہ ہے اور دوسرا پہلو اس کی ہمیشگی۔یہ رحمت، کسی دریا کی طرح مسلسل رواں ہے اور خاص مواقع پر یہ رحمت اپنے جوش پر بھی آ جاتی ہے۔رحمت الٰہی کا یہی جوش اور دوام انسان کے لئے ایک عظیم نعمت ہے۔خدا کی یہی صفت ہے جس کے باعث انسان کا اپنے رب سے جو تعلق قائم ہوتا ہے وہ محبت کا تعلق ہوا کرتا ہے۔اس موقع پر رحمٰن ورحیم کی صفت اسے خبر دار

بھی کرتی ہے کہ خدائے رحمان ورحیم کا نام لے کر جس کام کا آغاز کر رہا ہے وہ کسی کے لیے ادنی درجے کی بھی تکلیف کا سبب نہ بنے۔

بعض لوگ اپنی جہالت کے باعث خدا کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس نے انسان کو شاید عذاب دینے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ بات بات پر انسان سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسی انتظار میں رہتا ہے کہ جیسے ہی انسان کو دی ہوئی زندگی کی یہ مہلت ختم ہو، اسے پکڑ کر جہنم میں ڈال دے۔

یہ تصور بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید کی پہلی آیت یہ بیان کرتی ہے کہ اللہ تعالی سراپا رحمت ہے اور اس کی شفقت ابدی ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ قہار و جبار بھی ہے، لیکن اس کا غیظ و غضب صرف ان لوگوں تک محدود ہے جو اس کے مقابلے میں غرور و تکبر اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انسانوں کی عظیم اکثریت جو اپنے رب کے مقابلے پر سرکشی اختیار نہیں کرتی، ان کے ساتھ اللہ تعالی کا تعلق محبت اور رحمت کا ہے۔ وہ ان پر اپنا فضل و کرم نازل کرتا ہے اور اگر ان سے کوئی لغزش بھی سرزد ہو جاتی ہے، تو وہ توبہ کرتے ہی اسے فوراً معاف کر دیتا ہے۔

انسان کو اس بات پر غور کرتے رہنا چاہیے کہ ایسے محبت کرنے والے مالک و معبود کے ساتھ ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

ہدایت کی دعا

(نوٹ: سورہ الفاتحہ کے تفصیلی مطالعے کے لیے ہماری کتاب دیکھیں۔ سورہ الفاتحہ: فلسفہ و مذاہب کے تناظر میں)

قرآن مجید کو ایک سو چودہ (114) سورتوں یا ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں پہلی سورت، سورۃ الفاتحہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الْحَمْدُ لِلہ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ۔ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔ اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلا الضَّالِّينَ۔ (الفاتحہ 1-7 :1)

"تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو پوری کائنات کا رب ہے۔ بہت مہربان ہے اور اس کی شفقت ابدی ہے۔ روز جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، جن پر تیرا غضب نہیں ہوا اور جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔"

قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات اللہ نے تخلیق کی ہے۔ اللہ نے اسے ایسا بنا دیا ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ ایک عام انسان بھی یہ بات جانتا ہے اور جدید سائنسی تحقیقات سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس کائنات کا ڈیزائن بڑی ذہانت سے تیار کیا گیا ہے۔ تصور کیجیے کہ اگر زمین میں آکسیجن کی

مقدار میں کمی بیشی ہوتی، زمین کا فاصلہ سورج سے کم یا زیادہ ہوتا، زمین کی کشش کی قوت ہی کچھ بڑھ یا گھٹ جاتی، پودوں اور جانوروں کے تناسب میں کچھ زیادتی یا کمی واقع ہو جاتی، پانی کی مقدار کم یا زیادہ ہوتی، ہمارے جسم میں ہی ہاتھ، پاؤں یا آنکھیں نہ ہوتے تو ہماری زندگی کیا ہوتی؟

اللہ تعالی نے ہر چیز کو ایسا بنایا ہے کہ جو ہماری زندگی کے لئے لازم ہے۔ جب انسان ان باتوں پر غور کرتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان سے اپنے رب کی شکر گزاری اور تعریف کا جو کلمہ نکلتا ہے وہ یہی "الحمد للہ" ہے۔ ہمیں چاہیے کہ شکر گزاری اور اپنے رب کی تعریف کے اس کلمے کو اپنی شخصیت کا حصہ بنالیں۔ جب بھی ہمیں اپنے رب کی کوئی عنایت یاد آئے تو ہمارا رواں رواں اس کی شکر گزاری کے جذبے سے بھر جائے۔

انسان کا جو تعلق اپنے رب سے یہاں بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو صرف اور صرف اپنے رب ہی کی عبادت کرنی چاہیے۔

اس کے بعد ایک اہم معاملے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور وہ ہے مدد مانگنا۔ یہاں حکم دیا گیا ہے دنیاوی اسباب کے علاوہ انسان کو جب بھی کسی مافوق الفطرت (Supernatural) طریقے سے کچھ مانگنا ہو تو وہ صرف اپنے رب ہی سے مانگے۔ مذہب کی اصطلاح میں اس مانگنے کو 'دعا' یا 'استعانت' کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کو عبادت کا مغز قرار دیا ہے۔ چونکہ دعا عبادت کا اہم ترین حصہ ہے، اس لئے اسے بھی صرف اور صرف اپنے رب کے لئے ہی خاص کر دینا چاہیے۔

یاد رہے کہ آیت کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ "ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔" بلکہ اس میں حرف "ہی" بھی موجود ہے۔ خصوصی طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔" لفظ ایاک سے بالکل واضح کر دیا گیا ہے کہ مدد مانگنے کا معاملہ یہ نہیں کہ انسان اللہ سے بھی مدد مانگے اور پیر فقیر اولیا سے بھی مدد مانگے، بلکہ یہاں یوں کہا گیا ہے کہ تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔یعنی استعانت (مانگنے) کا یہ رشتہ صرف اور صرف اللہ سے ہی ہے۔

یہ ایک انتہائی اہم معاملہ ہے اس لیے اسے قرآن کے آغاز میں ہی بیان کر دیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں توحید پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ متعلقہ باب میں وہ فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ کے بارے میں انسانیت میں اختلاف اس کے اس کے خدا ہونے اور خالق ہونے کی بابت نہیں ہوا بلکہ اس حوالے سے ہوتا ہے کہ جب ذاتِ خداوندی کے علاوہ کسی اور ہستی / مخلوق کو مطلق طور پر کائنات کے نظم و نسق کا مالک و مختار اور مدبر مان لیا جائے تو یہ توحید کے منافی اور شرک ہے۔اسی بارے میں قرآن مجید میں بھی اشارہ ہے کہ "ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جو اللہ کو مانتے بھی ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں۔" (سورہ یوسف، آیت 106)

توحید کا یہ مرتبہ کہ بندہ اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو عبادت کے لائق نہ سمجھے اور صرف اللہ سے ہی رشتۂ عبودیت استوار رکھے۔ ہماری عبادت، نماز، دعا، قربانی، جینا اور مرنا سب کا سب اللہ ہی کے لئے ہونا چاہیے۔ یہی دین کا راستہ ہے اور یہ سیدھا راستہ اسے سیدھا خدا

کی بادشاہی یعنی جنت کی طرف لے جائے گا۔ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ نے اپنا انعام فرمایا۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جو اللہ کے نبیوں کے سچے پیروکار رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے رب کے فرمانبردار بن کر رہے ہیں، اس کے آگے سرکشی نہیں دکھاتے تھے اور دنیا کی ترغیبات اگر انہیں اس کی راہ سے بھٹکانے کی کوشش کرتیں تو ان سے بچ کر اپنے رب کی صراط مستقیم پر قائم رہتے۔

سورۃ فاتحہ قرآن کے دیباچے کی حیثیت رکھتی ہے۔اس میں ہدایت کی جو دعا سکھائی گئی ہے، یہی دعا ہم لوگ اپنی ہر نماز میں مانگتے ہیں۔ قرآن مجید اسی دعا کا جواب ہے جو اللہ کی طرف سے انسان کو دیا گیا۔ یہی وہ ہدایت ہے جو اس دعا کے صلے میں انسان کو عطا ہوئی۔ آیئے اب ہم اس ہدایت کا مطالعہ کریں۔

ایک حدیث میں بڑے دلنواز انداز میں سورۃ فاتحہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے: اللہ تعالی فرماتا ہے۔

"میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کر لیا ہے۔اس کا آدھا حصہ میرے لئے ہے اور آدھا میرے بندے کے لئے ہے۔" جب بندہ کہتا ہے 'الحمد للہ رب العالمین' تو اللہ فرماتا ہے، "میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔" جب بندہ کہتا ہے 'الرحمن الرحیم' تو اللہ فرماتا ہے، "میرے بندے نے میری ثنا کی۔" جب وہ کہتا ہے 'مالک یوم الدین' تو اللہ فرماتا ہے، "میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔" جب وہ کہتا ہے 'ایاک نعبد وایاک نستعین' تو اللہ فرماتا ہے، "یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے

کے لئے وہ ہے جو وہ مانگے۔" پھر جب وہ آخر سورت تک پڑھتا ہے (یعنی دعائے ہدایت مانگتا ہے) تو اللہ تعالی فرماتا ہے، " یہ میرے بندے کے لئے ہے۔ میرا بندہ جو مجھ سے مانگے وہ اس کے لئے ہے۔" (صحیح مسلم)

راہ راست پر کون لوگ ہیں؟

الم۔ ذَلِكَ الْكِتَابُ لا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالآخرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ أُوْلَئِكَ عَلَى هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ وَأُوْلَئِكَ هُمْ الْمُفْلِحُونَ (البقرة 5-1 :2)

یہ الف، لام، میم ہے۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ ان پرہیزگار لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی ہیں، ان پر ایمان رکھتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں اور وہی کامیابی پانے والے ہیں۔

قرآن مجید اب سے تقریباً ساڑھے چودہ سو برس پہلے نازل ہوا۔ اس وقت انسانی علوم جیسے فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی، اکنامکس، جیالوجی، آسٹرانومی اور تاریخ وغیرہ اپنی ابتدائی شکلوں میں موجود تھے۔ ان چودہ سو برس میں ان علوم میں بے پناہ کام ہوا ہے جس سے انسانی علم میں لاکھوں گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس عرصے میں اتنی علمی ترقی کے باوجود اس کتاب کی کسی ایک آیت میں بھی کوئی غلطی دریافت نہیں ہوئی۔

اگر آپ عربی جانتے ہیں تو اچھی بات ہے، ورنہ اپنی زبان میں کیا گیا قرآن کا ترجمہ اٹھا کر دیکھ لیجیے اور شروع سے آخر تک اس کتاب کو پڑھ لیجیے، آپ کو حیرت ہو گی کہ اس کتاب کا کوئی ایک جملہ بھی غیر سائنٹفک یا نامعقول نہیں ہے۔ دوسری طرف انسان کی لکھی ہوئی بہت سی کتب محض چند سالوں ہی میں از کار رفتہ (Obsolete) ہو جاتی ہیں مگر یہ کتاب ساڑھے چودہ سو برس میں بھی آبسولیٹ نہیں ہو سکی۔ ہے نا عجیب بات! اسی حقیقت کو یہ کہہ کر بیان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب ہر شک و شبہے سے پاک ہے۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب سراسر ہدایت ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو اپنے اندر چند صفات پیدا کر لیں۔ان صفات کی تفصیل یہ ہے:

- یہ لوگ تقوی کا رویہ اختیار کر لیں۔ تقوی کا مطلب ہے احتیاط اور پرہیز گاری کا رویہ۔ انسان بھلائی اور برائی میں تمیز کرنا جانتا ہو۔ نیکی کرنا چاہتا ہو اور برائی سے بچنا چاہتا ہو۔ جو لوگ جانوروں کی سی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور نیکی اور بدی میں فرق نہیں کرتے، ان کے لئے اس کتاب میں کچھ نہیں ہے۔
- قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل و استدلال کے ذریعے ان غیبی حقیقتوں کو ماننے کے لئے بھی تیار ہو جو انسان کے حواس خمسہ کی گرفت میں نہیں آتیں۔ ان حقیقتوں میں سب سے بڑی حقیقت خدا کا وجود ہے۔اگرچہ خدا کی ذات کو دیکھا، چھوا، چکھا، سنا اور سونگھا تو نہیں جا سکتا لیکن اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اور اس کا انٹیلی جنٹ ڈیزائن اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا بنانے

والا کوئی تو ہے۔ جو اتنی صریح اور معقول بات کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو اس سے کسی اور معقولیت کی توقع فضول ہے۔

- قرآن سے ہدایت پانے کی تیسری شرط یہ ہے کہ انسان صرف خدا کو ماننے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر اس کی عبادت کرنے کے لئے تیار بھی ہو جائے۔ اس عبادت کا سب سے اہم ظہور نماز کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ قدیم ترین عبادت ہے جو دنیا کے تمام خدا پرست مذاہب میں رائج رہی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دورِ قدیم کی اسی عبادت کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق بعض اصلاحات کے ساتھ جاری فرمایا ہے۔
- قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے کے لئے چوتھی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو جو مال اور رزق عطا کیا ہے وہ اس میں سے خدا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔ زر پرستی اور مادہ پرستی سے اجتناب کرنے والا ہو اور اپنے مال کو اللہ کی رضا کے لئے اس کی راہ میں خرچ کرے۔ مال کو جمع کر کر کے رکھنے کی بجائے اسے اللہ کے بندوں کے فائدے کے لئے خرچ کرے۔ اس خرچ کرنے سے انسان کو جو قلبی سکون ملتا ہے اسے وہی جانتے ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔
- پانچویں شرط یہ ہے کہ انسان اس بات کو مان لے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کر کے بس یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی ہدایت کا مسلسل اہتمام فرمایا ہے۔ ہدایت پانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان تعصب سے بالکل پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو ہدایت، جہاں اور جب بھی اپنے خاص بندوں پر نازل کی ہے جنہیں اصطلاحی طور پر انبیاء و رسل کہا جاتا ہے، وہ اسے ماننے کے لئے تیار ہو۔ یہ ہدایت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، داؤد اور عیسی

علیہم الصلوۃ والسلام سمیت تمام انبیاء پر نازل ہوئی اور اس کا آخری ورژن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ ایک نیک شخص کو ان تمام رسولوں اور ان کی ہدایت پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ اپنے نسلی و قومی تعصب کے باعث کسی ایک بھی نبی کو نہیں مانتے، یا خود کو آسمانی ہدایت سے بے نیاز سمجھتے ہوں، یا اپنے آباء و اجداد اور علماء و مشائخ کی پیروی کو اللہ کی ہدایت پر ترجیح دیتے ہوں، وہ قرآن کے اس سر چشمے سے کبھی فیض یاب نہیں ہو سکتے۔

- چھٹی شرط یہ ہے کہ انسان آخرت پر یقین رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان یہ مان لے کہ وہ ایک غیر ذمہ دار مخلوق نہیں ہے۔ یہ دنیا ابدی نہیں ہے۔ ایک دن اس کا خاتمہ ہونا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالی تمام انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے ان سے اس دنیا میں کیے گئے اعمال کا حساب لے گا۔ جس نے نیکی کمائی ہو گی وہ اس کا بدلہ جنت کی صورت میں پالے گا اور جس نے برائی کی ہو گی اور اس پر قائم رہا ہو گا، وہ اپنی سزا جہنم کی صورت میں بھگتے گا۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جنہوں نے غلطی کی مگر اس پہ قائم رہنے کی بجائے اللہ کے حضور جھک گئے، اللہ سے معافی مانگ لی اور آئندہ کے لیے برائی سے رک گئے ان کا بدلہ بھی جنت کی صورت میں ہو گا۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی کامل (Perfect) نہیں ہے۔ اس میں بہت سے خلا ہیں۔ یہاں بہت سے اچھے لوگوں کو ان کے نیک کاموں کا پورا اجر نہیں ملتا اور بہت سے قاتل، دہشت گرد، خائن اور بدکار اپنے اعمال کی سزا بھگتے بغیر دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ اگر انسان خدا پر یقین رکھتا ہو تو اس کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھے کیونکہ خدا ناانصاف نہیں ہو سکتا۔

جن انسانوں نے یہ چھ شرائط پوری کر دیں، ان کے بارے میں پوری صراحت کے ساتھ قرآن پاک میں یہ بتا دیا گیا کہ یہی لوگ ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ در حقیقت کامیاب ہیں۔ اگر آپ بھی ہدایت، فلاح اور کامیابی چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ ان چھ شرائط کو اپنی شخصیت کا حصہ بنالیں۔

تعصب اور ہٹ دھرمی کا انجام

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءأَنذَرْتَهِمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهِمْ لا يُؤْمِنُونَ۔ خَتَمَ الله عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهِمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (البقرة2-6 :2)

جن لوگوں نے (اللہ کی ہدایت کو تسلیم کرنے سے) انکار کر دیا، ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبر دار کرو یا نہ کرو، بہر حال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے۔ وہ سخت سزا کے مستحق ہیں۔

جب انسان کے پاس اللہ کی ہدایت آتی ہے تو وہ اس کا انکار صرف اور صرف اپنی انا، ضد، ہٹ دھرمی، حسد اور تعصب کے باعث ہی کرتا ہے ورنہ کوئی معقول شخص کبھی بھی خدا کے پیغام کو رد نہیں کر سکتا۔

جب انسان ضد اور ہٹ دھرمی کے اس انتہائی درجے پر پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالی یہ قانون ہے کہ وہ پھر ایسے آدمی کے لئے ہدایت کے دروازے بند کر دیتا ہے اور اس کے دل، کان اور آنکھیں گویا بند ہو جاتی ہیں۔ اگر کسی شخص کے ذہن میں اللہ تعالی اور اس کے پیغام کے بارے میں کوئی تردد یا سوال موجود ہے اور وہ خلوص نیت سے ان کا جواب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اللہ تعالی اس شخص کی راہنمائی کا انتظام کر دیتا ہے لیکن جب کوئی بدنیت ہو جائے اور یہ طے کر لے کہ کچھ بھی ہو مجھے حق

کو تسلیم نہیں کرنا تو پھر اسے اسی گمراہی کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو سارا معاملہ انسان کے رویے کا ہے۔ اگر جذبہ سچا ہے، نیت خالص ہے اور انسان تعصب اور ہٹ دھرمی کا شکار نہیں ہے تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن اگر اس نے طے کر لیا ہے کہ جس عقیدے، نظریے یا عمل کو میں نے اپنے گرد و پیش کے ماحول یا اپنے لیڈروں کی پیروی میں اپنا لیا، بس وہی درست ہے اور اس میں تبدیلی کی کبھی کوئی گنجائش نہیں تو پھر اس کے لئے سخت سزا کے علاوہ کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔

رسول ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں اس حقیقت کو تمثیل کے طریقے پر اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہی کا ایک نقطہ لگ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو یہ نقطہ صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ برائی کے راستے کو ہی اپنا شعار بنا لے تو پھر یہ نقطہ بڑھتا جاتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ اس کے پورے دل کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کے لئے پھر برائی اور بھلائی میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔

اگر ہم واقعی کامیابی حاصل کر کے خدا کی بادشاہی یعنی جنت میں داخل ہونا چاہتے ہیں جس کا ذکر تمام مذاہب کی کتب میں موجود ہے تو پھر ہمیں اپنے رویے کا جائزہ لینا ہو گا۔ اگر ہمارا رویہ سرکشی، تعصب اور ہٹ دھرمی کا ہے تو پھر یہی موقع ہے کہ ہم اس سے توبہ کریں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لازم ہے کہ ہم اپنے رب کے حضور سر جھکانے کا رویہ اختیار کریں اور جب بھی اس کی کوئی ہدایت کسی بھی ذریعے سے ہم تک پہنچے، اسے ماننے میں دیر نہ لگائیں۔

دوغلا رویہ

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَى شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ۔ اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوْا الضَّلالَةَ بِالْهُدَى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (البقرة16-14 :2)

جب یہ اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، اور جب اپنے شیطانوں سے علیحدگی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے تو ہم محض مذاق کر رہے تھے۔ اللہ ان سے استہزا فرماتا ہے، وہ ان کی رسی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے چلے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے، مگر یہ کاروبار ان کے لیے نفع بخش نہیں ہے اور یہ ہرگز صحیح راستے پر نہیں ہیں۔

بعض لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ ہوشیار سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ دوغلا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر نیک لوگوں سے ملیں تو ایسے جیسے ان سے زیادہ نیک اور کوئی نہیں ہے اور شیطان صفت لوگوں سے ملے تو نیک لوگوں کا مذاق اڑانے لگ جاتے ہیں۔ عام زبان میں انہیں منافق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مسلمانوں اور یہود میں ایسے ہی منافق موجود تھے جو ایسا دوغلا رویہ اپنائے ہوئے تھے۔

انسان منافقت کا رویہ کیوں اختیار کرتا ہے؟ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو منافقت کی اصل جڑ مفاد پرستی میں پوشیدہ ہے۔ بعض لوگ اپنے دنیاوی مفاد کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ اس کے لئے اخلاقیات کے تمام اصولوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگی میں اصل اہمیت کسی قسم کی اخلاقیات کی نہیں بلکہ ان کے اپنے ظاہری فائدے کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اچھے اور برے تمام لوگوں سے بنا کر رکھنے کے قائل ہوتے ہیں اور دونوں جانب سے مفادات حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

اپنے فائدے کا خیال رکھنا کوئی بری بات نہیں۔ اگر انسان اپنے حقیقی فائدے کو مد نظر رکھے تو وہ آخرت کا فائدہ ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی کمایا جاسکے گا وہ چند دن میں ختم ہو جائے گا لیکن آخرت کی کمائی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اپنے مفادات کا صحیح خیال رکھنا یہ ہے کہ انسان تھوڑے سے دنیاوی فائدے کے لیے آخرت کے لامحدود فائدے کو نظر انداز نہ کرے۔ اگر یہ سوچ بن جائے تو پھر انسان دوغلے پن سے نکل کر درست راستے پر آجاتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں بعض لوگ جو علی الاعلان برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ فخر سے یہ کہتے ہیں کہ "ہم منافق نہیں"۔ یہ ایک نہایت ہی سنگین رویہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسا انسان دوغلے پن سے بچ کر ایک طرف ہو گیا ہے لیکن اسے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ ایسا رویہ اختیار کر کے وہ براہ راست خدا کے مقابلے پر آ کھڑا ہوتا ہے اور اپنی برائیوں پر فخر کرنا شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے دل، آنکھوں اور کانوں کو حق سمجھنے کے لیے بند کر دیتا ہے۔ ایک خدا

پرست جو منافقت سے بچنا چاہتا ہے، وہ دوغلے پن سے نکل کر خالص برائی کی بجائے خالص نیکی کو اختیار کر لیتا ہے۔

نیک لوگوں کا مذاق اڑانے والوں کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالی نے انہیں اس دنیا میں جو ڈھیل دی ہوئی ہے یہ ان لوگوں کے لئے بھی محض ایک مذاق بن سکتی ہے۔ وہ اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے جائیں گے اور پھر یکایک ایک دن ان کے پاؤں تلے سے زمین سرک جائے گی اور وہ اپنے رب کی سزا کا سامنا کرنے کی حالت میں آ کھڑے ہوں گے۔ درست راستے کو چھوڑ کر غلط راستے کو اختیار کرنے کا یہ کاروبار کسی طور پر بھی ان کے حق میں فائدہ مند نہ ہو گا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنا چلتا ہوا نفع بخش کاروبار بیچ کر اس کے بدلے ایک نقصان دینے والا سفید ہاتھی خرید بیٹھے اور پھر اس کا نقصان ساری عمر بھگتتا رہے۔ ہمیں اپنی شخصیت کو دوغلے پن اور سرکشی دونوں رویوں سے پاک رکھنا چاہیے۔

خدا سے ہمارا تعلق

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمْ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الأَرْضَ فِرَاشاً وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنْ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَكُمْ فَلا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَاداً وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ. (البقرة22-21 :2)

اے انسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی، جو تمہارا اور تم سے پہلے گزرنے والے لوگوں کا خالق ہے، تاکہ تم پرھیزگار بن سکو۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، آسمان کی چھت بنائی، اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے تمہارے لیے ہر طرح کی پیداوار بطور رزق زمین سے نکالی۔ پس جب تم یہ جانتے ہو تو دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ بناؤ۔

یہ پوری نسل انسانی کے لیے اللہ تعالی کی وہ دعوت ہے جو مذہب کی بنیاد ہے۔ اللہ تعالی نے انسان کو جو بھی ہدایت عطا کی ہے، اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ اپنے رب کا فرمانبردار بندہ بن کر رہے اور خود کو اس کا بندہ ہی سمجھے۔ اگرچہ انسانوں نے سابقہ کتابوں میں مختلف نوع کی تحریف کر دی ہے مگر اپنی اصل کے اعتبار سے یہی تورات کا پیغام ہے۔ زبور اور انجیل میں بھی اسی کی دعوت دی گئی۔ گیتا بھی انسان کو اسی کی تلقین کرتی ہے۔ قرآن مجید کی پوری دعوت بھی اسی پیغام پر مشتمل ہے۔

خود کو خدا کا بندہ سمجھ کر اسی کی عبادت کرنا، یہی وہ رویہ ہے جو ایک خدا پرست انسان کو اختیار کرنا چاہیے۔ انسان اگر سرکشی سے اجتناب کرے اور عجز و انکسار اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگی اپنے رب کے نام کر دے۔ اسی کی عبادت کرے، اسی کے آگے سر جھکائے، اسی سے دعا کرے، اسی سے مدد کا طلبگار ہو اور اپنی زندگی اسی کے رسولوں کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق گزارے تو یہ سب کچھ غیر فطری اور غیر منطقی نہیں بلکہ انسان کی عقل و فطرت کے عین مطابق ہے۔ انسان اپنے رب کی بندگی کیوں کرے، اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چند نعمتیں بیان کی ہیں:

- زمین انسان کے لئے ایک بنا بنایا گھر ہے۔ اس زمین کا ڈیزائن کچھ ایسا ہے جو ہماری زندگی کے لئے موزوں ہے۔ صرف ایک پہلو ہی کو لے لیجیے۔ اگر زمین کا سورج سے فاصلہ موجودہ فاصلے کی نسبت کچھ ہی کم ہو جاتا تو اس کے نتیجے میں یہاں کا درجہ حرارت اتنا بڑھ جاتا کہ ہم زندہ نہ رہ سکتے۔ اگر یہ فاصلہ کچھ زیادہ ہو جاتا تو اتنی سردی ہو جاتی کہ ہم شاید پیدا ہی نہ ہو پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے یہ فاصلہ ٹھیک اتنا ہی رکھا ہے جتنا ہماری زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اس نے ایسا صرف ہمارے لیے کیا۔
- آسمان اور اس پر موجود اجرام فلکی ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہیں۔ ہماری توانائی کی تمام ضروریات اللہ تعالیٰ سورج کے ذریعے پوری کرتا ہے۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ ہمارے پروردگار کو ہمارا کتنا خیال ہے۔
- انسانی زندگی پانی کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے زمین میں پانی کے بہت سے ذخائر پیدا کئے ہیں۔ صرف اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ واٹر سائیکل کا ایسا نظام بنا کر رکھ دیا

ہے کہ یہ پانی بخارات کی صورت میں آسمان پر جاتا ہے اور پھر بلندیوں پر برس کر دریاؤں اور چشموں کی صورت میں ہم تک آ پہنچتا ہے۔ ایسا اس نے صرف ہمارے لئے کیا۔

- ہم لوگ زندہ رہنے کے لیے خوراک کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالی نے یہ خوراک مختلف پودوں اور ان کے پھلوں کے ذریعے ہم تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ خوراک اس نے محض ہمارے منہ پر ہی نہیں دے ماری بلکہ اسے نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ ذائقے دار پھلوں میں محفوظ کیا ہے۔ یہ انتظام بھی ہمارے لیے ہی ہے۔

ایک معقول انسان سے اگر کوئی احسان کرے تو وہ ہمیشہ اس کا شکر گزار رہتا ہے۔ اللہ تعالی نے ہم پر اتنے احسان کیے ہیں کہ ہم اس کا بدلہ تو کسی صورت میں نہیں دے سکتے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم اس کے شکر گزار بندے ہی بن کر رہیں اور اس کی ان نعمتوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیں۔ اس سے زیادہ کوئی اور مطالبہ اللہ تعالی ہم سے نہیں کرتا۔

اس کائنات کا ڈیزائن پکار پکار کر ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس کا خالق و مالک صرف ایک ہی ہے۔ اگر وہ ایک سے زائد ہوتے تو پھر یہ نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ دور قدیم کے انسان نے اپنی لاعلمی، جہالت، بے وقوفی، تعصب اور بے جا عقیدت کے باعث اپنے ذہن سے بہت سے خدا تخلیق کئے اور انہیں اللہ کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ دور جدید کا انسان اگرچہ ایسا تو نہیں سمجھتا لیکن اس نے اپنی لاعلمی اور بے جا عقیدت کے باعث اللہ کے نیک بندوں ہی کو اس کا مدمقابل تصور کر لیا ہے اور ان کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرنے لگا ہے جسکا مستحق صرف اور صرف اللہ ہے۔ قرآن ہمیں اس بات

کی دعوت دیتا ہے کہ کسی کو بھی اللہ کا مدمقابل قرار نہ دو کیونکہ یہ بات خلاف حقیقت ہے۔

بائبل میں اللہ تعالی کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنے کو زنا یعنی بے وفائی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسے کوئی بھی معقول شخص اپنے شریک حیات کو کسی اور کے ساتھ شریک کرنا پسند نہیں کرتا، اسی طرح اللہ تعالی کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا بھی بے وفائی کا ہی عمل ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا مسیح اور دیگر تمام انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام نے ہمیشہ اس بات کی تلقین فرمائی کہ ان کی ذات بابرکت کے معاملے میں کبھی ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے جو صرف اللہ تعالی کے لیے خاص ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا عیسی علیہ الصلوۃ والسلام سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

شک کرنے والوں کو قرآن کا چیلنج

وَإِنْ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنتُمْ صَادِقِينَ. فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ. (البقرة 2: 23-24)

اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کی مانند ایک سورت ہی بنا لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکو اور یقیناً نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر بنیں گے اور جو تیار کی گئی ہے حق کا انکار کرنے والوں کے لیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بعض لوگوں کو یہ شک گزرا کہ معلوم نہیں کہ یہ کتاب واقعتاً خدا ہی کی کتاب ہے یا محمد اسے اپنے پاس سے ہی گھڑ کر لے آئے ہیں۔ اللہ تعالی کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر شک (Skepticism) کا یہ رویہ خلوص نیت کی بنیاد پر ہو تو اللہ تعالی اس شک کو دور کرنے کے لئے واضح دلائل ارشاد فرماتا ہے۔

اگر ہم عرب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ اس دور میں عربوں کے ہاں ادب

(Literature) کو غیر معمولی حیثیت حاصل تھی۔اعلیٰ ادبی زبان کے جیسے خطیب اور شاعر ان کے ہاں پائے جاتے تھے، ویسے شاید ہی کسی قوم کو نصیب ہوئے ہوں۔ان کے میلوں میں شاعری اور خطابت کے مقابلوں کو وہی حیثیت حاصل تھی جیسے آج کل کی دنیا میں اولمپکس کھیلوں کو حاصل ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی قوم کے ایک فرد تھے اور ان کے ہاں چالیس سال گزار چکے تھے۔اس دور کا مکہ ہمارے دیہات کی طرح تھا جہاں ہر کوئی دوسرے کو اچھی طرح جانتا تھا۔اس طویل مدت میں عرب اچھی طرح جانتے تھے کہ محمد شعر و شاعری سے کوئی رغبت نہیں رکھتے اور انہوں نے کبھی کسی سے شعر و ادب کی کوئی تعلیم بھی حاصل نہیں کی۔ایسے میں اچانک آپ نے عربی فصاحت و بلاغت کا ایسا نمونہ پیش کرنا شروع کر دیا جو خود ان کے اعلیٰ پائے کے شاعروں اور ادیبوں کے بقول لاجواب تھا۔

اللہ تعالیٰ نے شک کرنے والوں کا شک دور کرنے کے لئے یہ چیلنج دیا کہ عرب کے تمام شاعر اور خطیب مل کر اس کلام کی ادبی شان کا کلام بنا لائیں۔کتنا آسان تھا قرآن کے منکروں کے لئے کہ وہ ایسا کر کے قرآن کو جھوٹا ثابت کر دیتے لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ کوشش کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکے۔

ان آیات میں ہماری شخصیت کا حصہ بننے کے لئے دو سبق ہیں۔ایک تو یہ کہ اللہ کے کلام کے بارے میں ہم شک میں مبتلا نہ ہوں اور Skepticism کے تمام فلسفوں کو اٹھا کر پھینک دیں اور

دوسرے یہ کہ اللہ تعالی کی سزا سے بچنے کی تیاری کریں۔ یہ تیاری کچھ مشکل نہیں۔ اس کے لئے ہمیں صرف اللہ تعالی کے مقابلے میں سرکشی کے رویے سے اجتناب کرنا ہو گا۔

فاسق کون لوگ ہیں؟

يُضِلُّ بِهِ كَثِيراً وَيَهْدِي بِهِ كَثِيراً وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلاَّ الْفَاسِقِينَ۔ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الأَرْضِ أُوْلَئِكَ هُمْ الْخَاسِرُونَ۔ (البقرۃ2: 26-27)

اللہ اس سے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو راہ راست دکھا دیتا ہے۔ گمراہی میں وہ انہی کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں، اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ حقیقت میں یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کو پڑھنے والے دو طرح کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو مثبت ذہن کے ساتھ اسے پڑھتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ راہ راست کی راہنمائی کر دیتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو منفی ذہن کے ساتھ قرآن پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے، حقیقت کی انہیں کوئی جستجو نہیں ہوتی، صحیح بات سے بھی یہ لوگ الٹے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یا تو یہ پہلے سے طے شدہ (Pre-determined) نتائج قرآن سے اخذ کرنا

چاہتے ہیں یا پھر ان کا مقصد ہی تنقید برائے تنقید ہوا کرتا ہے۔ایسے لوگوں کو اللہ تعالی نے فاسق یعنی نافرمان قرار دیا ہے۔ان کی چند صفات یہاں بیان ہوئی ہیں:

- یہ لوگ اللہ کے ساتھ مضبوطی سے کیا ہوا عہد توڑ دیتے ہیں۔ سورۃ اعراف میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو تخلیق کرنے سے قبل ان کی روحوں سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ اس کے فرمانبردار بندے بن کر رہیں گے۔اس عہد کو انسان کے شعور سے محو کر دیا گیا کیونکہ یہ دنیا آزمائش کے لئے بنائی گئی ہے۔ یہ عہد آج بھی انسان کے لاشعور میں موجود ہے۔ اسے انبیاء کرام کے ذریعے بار بار یاد کروایا گیا۔ اسی عہد کے نتیجے میں آج بھی کروڑوں افراد دنیا میں اللہ کے فرمانبردار بندے بن کر رہتے ہیں۔فاسق لوگ اس عہد کو توڑ دیتے ہیں۔
- ایفائے عہد کے حکم میں وہ تمام چھوٹے بڑے معاہدے آجاتے ہیں جو مذہبی احکامات سے متعلق ہوں یا معاشرتی معاملات سے۔ یہ حکم انسان کے تمام چھوٹے بڑے، تحریری و غیر تحریری معاہدوں پر محیط ہے۔ حلف اور لائسنس تحریری معاہدوں میں شامل ہے۔یہ معاہدے خواہ علانیہ (Expressed) کیے ہوں یا معاشرے میں طے شدہ حیثیت (Implied) رکھتے ہوں،ان سب کی پابندی ضروری ہے۔ ملکی آئین کی حیثیت معاہدے ہی کی ہے جس پر عمل کرنا دین کا حکم ہے۔خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی ریاست کے قوانین موجودہ دور کی طرح بطور آئین کی شکل میں موجود تھے ، اس کے علاوہ جو معاہدے کیے جاتے تھے ان کی پاسداری لازم ہوتی

تھی۔ نیز امیر یا حاکم جو حکم دیتا مسلمانوں کے لیے اس کی پیروی شریعت کی رُو سے ضروری تھی۔ لہٰذا ایک مسلمان کے لیے یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ ان تمام معاہدوں کا پاس رکھے جو اس نے معاشرے میں کسی بھی حیثیت سے کیے ہوں۔ ٹریفک کے قوانین، پارکنگ، امن وامان سے متعلق قوانین، ناجائز تجاوزات اور دیگر کسی بھی قسم کی خلاف ورزی اس میں شامل ہے۔

- اللہ تعالی نے انسان کو رشتوں اور تعلقات کا پابند کیا ہے۔ والدین، اولاد، میاں بیوی، بہن بھائی، دوست، حکومت، دوسری اقوام ان سب سے انسان کے رشتے اور معاہدے وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اگر ان رشتوں اور معاہدوں کو توڑا جائے تو اس کے نتیجے میں زمین فساد سے بھر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے رشتوں، معاہدوں اور تعلقات کی اہمیت خدا کے دین میں رکھی گئی ہے۔ ان رشتوں کو توڑنا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب دوسرا فریق خدا کے مقابلے میں سرکشی اور ظلم کا مرتکب ہو۔ فاسق لوگ ان رشتوں اور وعدوں کو بغیر کسی وجہ کے ہی توڑ ڈالتے ہیں۔
- فاسق لوگوں کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ زمین میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ فساد خواہ قتل ودہشت گردی کی صورت میں ہو یا پھر بددیانتی اور حقوق کو غصب کرنے کی صورت میں، دونوں صورتوں میں اس سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔

ان آیات کا سبق یہ ہے کہ ہمیں ہر صورت میں فاسقین کی ان خصوصیات سے اجتناب کرنا ہے، اور قرآن کو اپنے عقیدے کے لیے دلائل نہیں بنانا تاکہ ہم قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے

قابل ہو سکیں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

خدا پرستی کی دعوت

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ۔ وَآمِنُوا بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقاً لِمَا مَعَكُمْ وَلا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَناً قَلِيلاً وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ۔ وَلا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ۔ أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلا تَعْقِلُونَ۔ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِينَ۔ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ (البقرة 2: 40-46)

اے بنی اسرائیل! ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تمہیں عطا کی تھی۔ میرے ساتھ تمہارا جو عہد تھا، اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمہارے ساتھ تھا، اسے میں پورا کروں اور مجھ ہی سے ڈرو۔ میں نے جو کتاب بھیجی ہے اس پر ایمان لاؤ۔ یہ اس کتاب کی تائید میں ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی، لہذا تم سب سے پہلے اس کے منکر نہ بن جاؤ۔ تھوڑی سی قیمت پر میری آیات کو نہ بیچ ڈالو اور میرے غضب سے بچو۔ باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہ نہ بناؤ اور نہ حق کو جانتے بوجھتے چھپانے کی کوشش کرو۔ نماز قائم کرو، زکوۃ دو اور جو لوگ میرے آگے جھک رہے ہیں، تم بھی ان کے ساتھ ہی جھک جاؤ۔ تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے کام

نہیں لیتے؟ صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک یہ ایک مشکل کام ہے مگر ان فرمانبردار بندوں کے لئے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

ان آیات میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے اللہ کے دین کی دعوت دی گئی ہے۔ اگرچہ یہاں خطاب بنی اسرائیل سے ہے لیکن پیغام کی نوعیت سے واضح ہے کہ یہ دعوت پوری نسل انسانیت کے لئے ہے۔ اس دعوت کے اہم نکات یہ ہیں:

- اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھا جائے اور کبھی اس کی ناشکری نہ کی جائے۔ اگر بائبل میں درج کی گئی بنی اسرائیل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ اللہ تعالی نے قدم قدم پر ان پر بہت سی نعمتیں نازل کیں۔ انہیں دنیا کی سپر پاور کا منصب عطا کیا اور اللہ تعالی کی نافرمان قوموں کو ان کے سامنے مفتوح کر دیا۔
- اللہ تعالی کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کیا جائے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالی کا وعدہ تھا کہ وہ انہیں بحیثیت قوم اس دنیا ہی میں اپنی اس جزا و سزا کا نمونہ بنا دے گا جو آخرت میں سب کے ساتھ ہو گا۔ بنی اسرائیل کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے جب بھی اللہ تعالی کی اطاعت کی، انہیں اسی دنیا میں اس کی جزا دی گئی اور جب وہ اللہ تعالی کے نافرمان ہوئے، انہیں اسی دنیا میں اس کی سزا ملی۔ جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں،

وہ اس کی تفصیل اس لنک پر دیکھ سکتے ہیں۔

www.mubashirnazir.org/ER/L0015-08-Safarnama.htm

- صرف اور صرف اللہ ہی سے ڈرا جائے۔
- بغیر کسی تعصب کے اللہ کی تمام کتب اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لایا جائے۔ اس معاملے میں اپنے تمام قومی اور نسلی تعصبات کو فراموش کر دیا جائے۔ بعض اہل کتاب اس تعصب کا شکار ہو گئے کہ انہوں نے اپنی کتاب تورات کو تو مان لیا لیکن بعد میں آنے والی کتب انجیل اور قرآن کا انکار کر دیا حالانکہ یہ اللہ کی اسی ہدایت کے بعد میں آنے والے ورژن ہیں جو تورات میں نازل کی گئی۔
- جب اللہ کا پیغام سامنے آئے تو اس کا انکار نہ کیا جائے۔
- اللہ کے پیغام کو چھوڑ کر دنیا کے مفادات کو ترجیح نہ دی جائے۔ اہل کتاب کے بعض علماء تھوڑی سی رقم کے عوض دین کی درست بات بتانے کی بجائے اس میں تبدیلی کر دیتے۔ یہاں انہیں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے۔
- حق و باطل کی آمیزش کی کوشش نہ کی جائے۔ نیکی اور بدی کے بارے میں اشتباہ پیدا نہ کیا جائے۔
- حق بات کو چھپانے کی کوشش نہ کی جائے۔ حق کو چھپانا، باطل کی ترویج کے مترادف ہے۔ اس سے اجتناب کیا جائے۔
- نماز قائم کی جائے۔ یہ ایک قدیم عبادت ہے جو بنی اسرائیل میں بھی اسی طرح رائج تھی

جیسا کہ آج ہمارے ہاں ہے۔

- زکوۃ دی جائے۔ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرنے کی عبادت بنی اسرائیل کے ہاں بھی رائج تھی۔ اسے بائبل میں دہ یکی (عشر یا دس فیصد) کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔
- اللہ تعالی کے آگے جھکنے والے فرمانبردار لوگوں کے ساتھ تعلق قائم کیا جائے۔ جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ آ ملنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ان کی تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے غیر متعصب اور نیک لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ انسان کو انہی لوگوں کے قریب ہونا چاہیے جن کے دل اور سر اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہوں۔
- دوسروں کو نیکی کی تلقین کے ساتھ خود بھی اس پر عمل کیا جائے۔ دوسروں کو نصیحت کرتے ہوئے خود کو بھول جانا معقولیت نہیں۔ اللہ تعالی انسان کو دوسروں کا احتساب کرنے والا نہیں بلکہ خود احتسابی کا عادی بنانا چاہتا ہے۔ ایک خدا پرست انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر وقت اپنا احتساب کرتا رہے اور اس کے علاوہ جہاں اسے دوسروں میں بھی کوئی برائی نظر آئے تو اس کی احسن انداز میں اصلاح کی کوشش کرے لیکن اس اصلاحی عمل کا آغاز اپنی ذات سے کرنا چاہیے۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے بے عمل عالم اور خطیب دکھائے گئے، ان کے ہونٹوں کو قینچیوں سے کاٹا جا رہا تھا۔ (ابن کثیر)

- مصیبت میں صبر اور نماز سے مدد لی جائے۔ اگرچہ صبر کرنا اور نماز کے ذریعے اپنے رب سے تعلق قائم کر کے حوصلہ حاصل کرنا آسان کام نہیں لیکن یہ ان لوگوں کے لئے آسان ہو جاتا ہے جو اس بات کو یاد رکھتے ہیں کہ انہیں بالآخر اپنے رب سے جا ملنا ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کو یاد رکھے کہ آخر میں نے اپنے رب سے ملنا ہی ہے تو پھر اس کے لئے ہر مصیبت آسان ہو جاتی ہے۔

اگر ان صفات کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیا جائے تو پھر انسان ایک سچا خدا پرست بن جاتا ہے جو اپنے رب سے ملاقات کے وقت، اس ملاقات سے لطف اندوز ہو سکے گا۔

نجات کا دار و مدار کسی قوم سے تعلق پر نہیں ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرة62 :2)

یقین جانو کہ جو لوگ اب ایمان لائے (یعنی مسلمان) یا وہ جو یہودی، عیسائی یا صابی ہوئے، جو بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا، اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔ اسے نہ تو (مستقبل کے) اندیشے لاحق ہوں گے اور نہ ہی (ماضی کے) پچھتاوے۔

قوم پرستی ہر قسم کے تعصب کی بنیاد ہے۔ انسان جب کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے تو وہ اس کے بارے میں ایک خاص قسم کے تعصب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج کے دور میں مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ جنت صرف انہی کے لئے ہے اور باقی سب قومیں جہنم میں جائیں گی۔ کچھ ایسا ہی تصور دیگر اقوام کا اپنے متعلق ہے۔

قرآن مجید کا نقطہ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالی کے نزدیک کسی ایک قوم کا فرد ہونے کا

نجات سے کوئی تعلق نہیں۔ نجات کا معیار (Criteria) بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالی کے ہاں ہماری نجات اس بات پر نہیں ہو گی کہ ہم خود کو مسلمان، یہودی، عیسائی، صابی، ہندو، سکھ، یا بدھ کہتے ہیں۔ نجات اس بات پر ہو گی ہم خدا پر ایمان لائیں اور اس کے سامنے جوابدہی کو یاد رکھیں۔ دنیا میں نیک اعمال کرتے ہوئے اپنی زندگی ایک خدا پرست انسان کے طور پر بسر کریں۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے ایک غلط فلسفہ اخذ کیا ہے کہ چونکہ یہاں اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لانے کا ذکر نہیں ہے اس لئے یہ کچھ ضروری نہیں ہے۔ یہ غلط طریق کار ہے۔ اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا اور جانتے بوجھتے ان کا انکار نہ کرنا اللہ پر ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کا حصہ ہے۔ جیسے کوئی شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے تو وہ سزا کا مستحق ہے اسی طرح جو شخص جانتے بوجھتے اللہ کے کسی پیغمبر کا انکار کر دے، وہ بھی ایک بڑے جرم کا مرتکب ہوتا ہے جس کی سزا اسے بھگتنا ہو گی۔ اللہ اور یوم آخر نجات کی اساس ہے البتہ یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی حقانیت جان لینے کے باوجود انکار کرتا ہے تو وہ ان بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کی بنیاد پر نجات کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے رسول جب بھی اس کے دین کی دعوت دیتے رہے، اس کے نتیجے میں جو لوگ ان پر ایمان لائے، وہ ہر طرح کے تعصب سے پاک ہو کر خالص ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرتے رہے۔ چند نسلوں کے بعد یہ لوگ قوم کی شکل اختیار کر جاتے۔ قرآن مجید ان گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر خالص ایمان اور عمل صالح ہی کو نجات کا معیار قرار دیتا ہے۔

نجات کیا ہے؟اس دنیا کی زندگی میں انسان کو کتنی ہی نعمتیں میسر کیوں نہ ہوں،اس کا پیچھا دو چیزوں سے نہیں چھوٹ سکتا: ایک ماضی کے پچھتاوے اور دوسرا مستقبل کے اندیشے۔ اللہ تعالی یہ بیان کرتا ہے کہ آخرت کی زندگی میں نجات پانے کے بعد انسان کو ان دونوں سے نجات مل جائے گی۔ کتنا خوش نصیب ہے وہ شخص جسے یہ نعمت حاصل ہو گئی اور کتنا بد نصیب ہو گا وہ شخص جسے ابدی زندگی میں بھی ماضی کے پچھتاوے اور مستقبل کے اندیشے گھیرے رہیں گے !!!!

نرم دل

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (البقرة74 :2)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے، پتھروں کی طرح سخت، بلکہ سختی میں کچھ ان سے بھی زیادہ، کیونکہ پتھروں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جس میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں، کوئی پھٹتا ہے تو اس میں سے پانی نکل آتا ہے اور کوئی خدا کے خوف سے لرز کر گر بھی پڑتا ہے۔ اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ہے۔

اللہ تعالی کی تخلیق کردہ اس کائنات میں دو طرح کے نظام چل رہے ہیں۔ ایک وسیع تر کائنات ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے اور دوسری انسانی دنیا ہے جس میں اللہ تعالی نے محدود پیمانے پر انسان کو نیکی یا بدی کا انتخاب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔

اللہ تعالی کی مرضی کے مطابق چلنے والی کائنات کی ایک سخت چیز پتھر ہیں جن کے بارے میں یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مخلوق اللہ تعالی کے حکم سے سرتابی تو کیا کرے گی، یہ اللہ کے حکم کو ماننے کے

لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہے، اس کے خوف سے لرزتی رہتی ہے اور اس سخت چیز سے بھی پانی کے چشمے بہہ نکلتے ہیں۔ ایک انسان ہے جس کا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رب کے آگے سرکشی پر اتر آتا ہے اور اس کی آنکھ سے خدا کے خوف سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں ٹپک پاتا۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "چار چیزیں بدبختی کی علامت ہیں: خوف الہی سے آنکھوں میں آنسو نہ بہنا، دل کا سخت ہو جانا، امیدوں کا طول کھینچنا اور انسان کا لالچی ہو جانا۔" ایک اور حدیث میں ہے، "سخت دل والا اللہ سے بہت دور ہو جاتا ہے۔" (تفسیر ابن کثیر)

انسان کے وجود کا تزکیہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا دل اپنے رب کے آگے جھکا ہوا ہو اور نرم ہو۔ نرم دل کا مطلب یہ ہے کہ یہ دل اللہ کی ناراضی کے خوف سے کانپتا رہے اور حق بات کو قبول کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہے۔ سیدنا مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کی دعوت بالخصوص دل کی اسی نرمی کی دعوت تھی کیونکہ آپ کے مخاطبین کی اکثریت شقاوت قلب کے مرض میں مبتلا تھی۔ اب سے دو ہزار برس قبل گلیل کی جھیل کے کنارے ایک پہاڑی پر اپنے مشہور زمانہ وعظ میں آپ نرم دل والوں کو یہ مژدہ جانفزا سنا گئے:

مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی (جنت) انہی کی ہے۔۔۔۔۔

مبارک ہیں وہ جو غمگیں ہیں کیونکہ ان کے دل تسلی پائیں گے۔۔۔۔۔۔

مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔۔۔۔۔۔

مبارک ہیں وہ جنہیں راستبازی کی بھوک اور پیاس ہے کیونکہ وہ مطمئن ہوں گے۔۔۔۔۔

مبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں کیونکہ ان پر رحم کیا جائے گا۔۔۔۔۔۔

مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔۔۔۔۔۔

مبارک ہیں وہ جو صلح کرواتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے (یعنی محبوب بندے) کہلائیں گے۔۔۔۔۔

مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے جاتے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہی انہی کی ہے۔۔۔۔۔

(انجیل متی 5:3-10)

بے بنیاد امیدیں

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلاَّ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلاَّ يَظُنُّونَ۔ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ۔ وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلاَّ أَيَّاماً مَعْدُودَةً قُلْ أَاتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللَّهِ عَهْداً فَلَنْ يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لا تَعْلَمُونَ۔ (البقرة 2: 78-80)

ان میں ایک گروہ امیوں کا ہے، جو کتاب کا علم تو رکھتے نہیں، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان کے لئے جو اپنے ہاتھ سے قانون لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے آیا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑی سی قیمت حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لئے تباہی کا سامان ہے اور ان کی کمائی بھی ان کے لئے موجب ہلاکت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند روز سے زیادہ چھونے والی نہیں ہے۔ ان سے پوچھو، کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے جس کی خلاف ورزی وہ نہیں کر سکتا یا پھر تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں ڈال رہے ہو جن کا خود تمہیں علم نہیں ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کے بہت سے افراد کے کچھ امراض کی طرف نشاندہی فرمائی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو آج کے دور میں ہم لوگ بھی انہی کا شکار نظر آتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے ہاں دو گروہ تھے، ایک ان کے اہل علم اور دوسرے عام لوگ۔ علماء اور مذہبی رہنما کہلانے والے بہت سے لوگوں میں کرپشن اس حد تک سرایت کر چکی تھی کہ وہ مختلف گروہوں کے مفادات کے تحت تھوڑی سی رقم لے کر اللہ کے قانون میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیتے۔ انہوں نے نہ صرف اللہ کی کتاب کو اپنی خواہشات کے مطابق تبدیل کیا بلکہ اپنی تفاسیر ، قومی تاریخ، خیالی فلسفے اور فقہی اجتہادات کو بائبل کا حصہ بنا دیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالی کی صاف اور سادہ شریعت مسائل کا انبار بن کر رہ گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تمام چیزیں بھی وہی تقدس حاصل کر گئیں جو اللہ کی کتاب کو حاصل تھا۔

دوسری طرف ان کے عام لوگوں کا یہ عالم تھا کہ وہ محض اپنے وہم و گمان سے کچھ باتیں فرض کر بیٹھتے تھے اور ان پر خوش رہا کرتے تھے۔ ان کے عام لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا تھا کہ چونکہ ہم لوگ اللہ کے پاکیزہ انبیاء ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم الصلوۃ والسلام کی اولاد ہیں اس لئے آخرت میں ہم سے زیادہ حساب کتاب نہ لیا جائے گا بلکہ محض چند روز سزا دے کر ہمیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس خیال نے انہیں دین پر عمل کرنے سے دور کر رکھا تھا اور اخلاقی برائیوں کی کھلی چھوٹ دے دی تھی۔ یہ لوگ دین کا صحیح علم حاصل کرنے کی بجائے اپنے وہم و گمان کی دنیا ہی میں مست تھے اور علم دین کو ان کے ہاں غیر ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔

اگر ہم آج کی دنیا میں اپنا جائزہ لیں تو ہمارا حال بھی اس سے زیادہ کچھ مختلف نہیں ہے۔ایک طرف ہمارے عالم کہلانے والے لوگ بھی ہیں جو اپنے اور اپنے بزرگوں کے خیالات و نظریات اور اجتہادات کو اللہ کی کتاب پر فوقیت دیتے ہیں۔دوسری طرف ہمارے عام لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ جہالت ہے۔دین کا صحیح علم حاصل کرنے کا ہماری اکثریت کو کوئی شوق نہیں البتہ اس امید کے سہارے ہم دین کے احکام سے دور ہو چکے ہیں کہ چونکہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اس لئے ہماری نجات تو گارنٹیڈ ہے۔قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث میں اس تصور کی مذمت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اب نجات صرف اور صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر انسان اللہ کے رسول کی صحیح معنوں میں پیروی کرے۔

دور قدیم کے بنی اسرائیل اور ہمارے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی کتاب میں بہت کچھ شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے لیکن ہمارے ہاں ایسا نہ ہو سکا۔قرآن مجید حرف بحرف وہی ہے جو اللہ نے نازل کیا اور پوری طرح محفوظ ہے۔ایسا ضرور ہوا کہ بہت سی دوسری چیزوں کو ہمارے ہاں متبرک ٹھہرا لیا گیا ہے لیکن اللہ کی کتاب کی عظمت پوری طرح ہمارے دلوں میں نقش ہے اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اسی کتاب کو مشعل راہ سمجھتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ پوری طرح واضح ہے کہ قرآن اور سنت میں دیا گیا اللہ تعالی کا حکم کیا ہے اور بعد کے لوگوں سے منسوب کیا چیزیں ہیں جنہیں لوگ اللہ کی شریعت کا حصہ سمجھ بیٹھے ہیں۔اس طرح علمی اعتبار سے ہم درست جگہ پر کھڑے ہوئے ہیں۔ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اللہ کی شریعت

کو دوسری چیزوں سے الگ کر کے خالص طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور عوام الناس میں موجود اوہام اور خرافات کو دور کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

بنی اسرائیل سے اللہ کا عہد

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لا تَعْبُدُونَ إِلاَّ اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْناً وَأَقِيمُوا الصَّلاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلاَّ قَلِيلاً مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ۔ (البقرة83 :2)

یاد کرو، ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، والدین، رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں سے اچھا سلوک کرنا، لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا اور زکوۃ دینا۔ پھر تھوڑے سے افراد کے سوا تم اس عہد سے پھر گئے اور تم خود اس بات کے گواہ ہو۔

بنی اسرائیل سے لیا جانے والا یہ عہد یہاں مختصراً بیان ہوا ہے۔ تورات میں اس کی تفاصیل احکام عشرہ (Ten Commandments) کے ساتھ اب بھی موجود ہیں۔

1. میرے حضور تم غیر معبودوں کو نہ ماننا۔
2. تم کسی بھی چیز کی صورت کا خواہ وہ اوپر آسمانوں میں یا نیچے زمین پر یا پانیوں میں ہو، بت نہ بنانا۔
3. تم خداوند اپنے خدا کا نام بری نیت سے نہ لینا کیونکہ جو اس کا نام بری نیت سے لے گا، خدا اسے بے گناہ نہ ٹھہرائے گا۔

4. سبت (ہفتے) کے دن کو یاد سے پاک رکھنا۔ چھ دن تم محنت سے کام کرنا لیکن ساتواں دن خداوند تمہارے خدا کا سبت ہے۔ اس دن نہ تو تم کوئی کام کرنا اور نہ ہی تمہارا بیٹا یا بیٹی، نوکر یا نوکرانی، تمہارے چوپائے اور تمہارے پاس مقیم مسافر کوئی کام کریں۔
5. اپنے باپ اور ماں کی عزت کرنا تاکہ تمہاری عمر اس ملک میں جو خداوند تمہارا خدا تمہیں دیتا ہے، دراز ہو۔
6. تم (کسی کا) خون نہ کرنا۔
7. تم زنا نہ کرنا۔
8. تم چوری نہ کرنا۔
9. تم اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا۔
10. اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ نہ کرنا۔ تم اپنے پڑوسی کی بیوی (کے حصول) کا لالچ نہ کرنا اور نہ ہی اس کے غلام یا کنیز کا، نہ اس کے بیل یا گدھے کا اور نہ ہی کسی اور چیز کا۔ (کتاب خروج 20:3-17)

نماز اور زکوٰۃ کا حکم تورات میں اور مقامات پر آیا ہے۔ بائبل میں موجود اسرائیلی تاریخ گواہ ہے کہ سوائے نیک لوگوں کے ایک گروہ کے ان کی اکثریت نے اس عہد کی نافرمانی کی۔ یہی عہد اللہ تعالیٰ نے ہم سے لیا ہے۔ یہ اخلاقیات کے وہ بنیادی اصول ہیں جو پوری نسل انسانیت کا سرمایہ ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ان احکامات کی نافرمانی کرنے والوں کی تعداد کم نہیں۔

اللہ کو ماننا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا حقوق اللہ کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے۔ اسی اللہ کی عبادت کے لئے نماز قائم کرنا بھی اخلاقیات ہی کا تقاضا ہے کیونکہ جو رب ہم پر اتنے احسان فرماتا ہے، ہمیں بھی اس کی بندگی کرنی چاہیے۔ اس کے بعد حقوق العباد کی تفصیلات ہیں جن میں والدین اور دیگر انسانوں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ بات کسی تفصیل کی محتاج نہیں کہ انہی احکامات پر عمل کرنے کے نتیجے میں ایسا معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے جہاں انسان سکون سے رہ سکیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے دین میں انسانیت کتنی اہم قدر ہے کہ بنیادی عہد میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں ان احکامات کو جاری و ساری کریں اور انہیں اپنی شخصیت کا حصہ بنائیں۔

اللہ کے رسول کا ادب واحترام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ (البقرة 2: 104)

اے ایمان والو! 'راعنا' نہ کہا کرو بلکہ 'انظرنا' کہا کرو اور توجہ سے بات کو سنا کرو۔ یہ انکار کرنے والے تو دردناک سزا کے مستحق ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنے والے بعض یہودی اور منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ظاہری احترام کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ان کی یہ کوشش ہوا کرتی کہ وہ کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی کر سکیں۔

'راعنا' ایک ذو معنی لفظ تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سنتے ہوئے اگر کبھی کوئی بات سمجھ نہ پاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رعایت کی درخواست کرتے ہوئے یہ لفظ بول کر بات کو دوہرانے کے لئے کہتے۔ اس لفظ کو ذرا لچکا کر بولا جائے تو یہ ایک اہانت آمیز لفظ بن جاتا۔ اللہ تعالی نے اہل ایمان کو اس لفظ کے استعمال سے روک دیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ایسے موقع پر 'انظرنا' یعنی ہم پر نظر فرمایئے کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ حاصل کریں۔ ہونا تو یہ

چاہیے کہ وہ بات کو پہلے ہی توجہ سے سنیں تاکہ اس کی نوبت نہ آئے۔

اس حکم کو اللہ تعالی نے قرآن مجید کا حصہ بنا دیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و حرمت کے معاملے کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حیثیت اللہ کے نزدیک ہے، اس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ضروری ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کا انتہائی درجے میں ادب و احترام کیا جائے اور کوئی ایسا لفظ نہ بولا جائے اور نہ ہی ایسا عمل کیا جائے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ادنی درجے میں بھی گستاخی کا کوئی شائبہ ہو۔ یہی رویہ دیگر انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے۔

موجودہ دور میں اہل مغرب کے ہاں افراط و تفریط کے جو رویے پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک معاملہ یہ بھی ہے۔ انہوں نے اس بات کو آزادی اظہار (Freedom of Expression) کا مسئلہ بنا لیا ہے کہ کوئی شخص اگر چاہے تو اللہ کے کسی رسول کی شان میں گستاخی کر دے۔ آزادی اظہار ایک بڑی قدر ہے اور اسلام اس کو اہل مغرب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے لیکن اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ انسان کی آزادی کی حدود وہاں ختم ہو جاتی ہیں جہاں کسی دوسرے انسان کی آزادی کی حدود ختم ہوتی ہیں۔

علمی گفتگو اور سوال کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن دوسرے کے مذہب اور مذہبی شخصیات کے بارے میں گستاخانہ رویہ اختیار کرنا ایسا معاملہ ہے جہاں ان کی آزادی اظہار دوسرے کی آزادی میں دخل انداز ہو جاتی ہے۔ یہ رویہ سراسر انسانیت اور اعلی اخلاقی اقدار کے خلاف ہے۔ ہمیں

احسن انداز میں اپنا نقطہ نظر دنیا کے سامنے واضح کر دینا چاہیے اور اہل مغرب کو اس بات کی دعوت دینا چاہیے کہ ان کی جانب سے ایسا رویہ اختیار کرنا سراسر بد تہذیبی اور بداخلاقی ہے جس کی اصلاح ان پر لازم ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ہم دوسرے مذاہب کی محترم شخصیات کے بارے میں احترام کا رویہ اختیار کریں تاکہ امن اور سکون کے ماحول میں مثبت مکالمے کا عمل جاری رہ سکے۔

کردار نہ کہ موروثی تعلق

وَإِذْ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۔ (البقرة124 :2)

یاد کرو کہ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گئے۔ اس نے فرمایا، "میں تمہیں انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔" انہوں نے عرض کیا، "کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔" فرمایا، "میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔"

سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی پوری سیرت اللہ تعالی کے حضور تسلیم و رضا کی عظیم ترین مثال ہے۔ آپ کی پوری زندگی اللہ تعالی کے دین کے لئے قربانیوں پر مشتمل ہے۔ اپنی قوم سے اس کے شرک کے باعث علیحدگی اختیار کرنا، ایک جبار اور متکبر بادشاہ سے نڈر ہو کر اسے اللہ کا پیغام پہنچانا، آگ میں پھینکے جانے کو برداشت کرنا، وطن اور گھر بار کو اللہ کے حکم سے چھوڑنا، فلسطین اور عرب کی سرزمین پر اللہ کی توحید کے مراکز قائم کرنا، بیوی اور بچے کو اللہ کے حکم سے ریگستان میں اللہ کے بھروسے چھوڑ جانا اور پھر اپنی اولاد کو اللہ کے حکم سے قربان کرنا یہ سب تسلیم و رضا کی شاندار مثال ہے۔

انہی قربانیوں کے باعث اللہ تعالی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آپ کو دنیا کا امام بنا دے گا۔ قرآن مجید اور بائبل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے یہی وعدہ آپ کی اولاد کے معاملے میں بھی کیا اور انہیں اسی دنیا میں آخرت کی جزا و سزا کا نمونہ بنا کر رکھ دیا۔ اگر انہوں نے نیکی کی تو بحیثیت قوم انہیں اس کا اجر اسی دنیا میں مل گیا اور جب بھی وہ گمراہ ہوئے تو انہیں اسی دنیا میں سزا دی گئی۔ پہلے یہ معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معاملہ بنی اسماعیل کے ساتھ شروع ہوا۔

آج بھی مشرق وسطی بلکہ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اولاد ابراہیم کی یہ دونوں شاخیں اپنی غلط فہمی کے باعث یہ سمجھ بیٹھی ہیں کہ ان کا یہ منصب موروثی ہے اور وہ بحیثیت اولاد ابراہیم اس کی حق دار ہیں۔ اسی غلط فہمی کے باعث آپ کی اولاد کی ایک شاخ گریٹر اسرائیل کے قیام کے لئے کوشاں ہے اور دوسری دنیا بھر پر اپنا تسلط قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کشاکش کے نتیجے میں دنیا کا امن تباہ ہو رہا ہے۔

اگر مسلمان قرآن کی اس آیت کو غور سے پڑھیں اور یہود اسی مضمون پر مشتمل کتاب مقدس کی آیات کا مطالعہ کریں تو ان پر یہ واضح ہو گا کہ دنیا کی امامت کا یہ منصب موروثی نہیں ہے بلکہ اس بات سے مشروط ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالی اور اس کے دین سے اپنا صحیح تعلق قائم کریں، اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائیں، نیکی پر قائم ہوں، ظلم سے اجتناب کریں اور دنیا میں خدا پرستی کا زندہ نمونہ بن کر جئیں۔ اللہ تعالی کے ہاں موروثی تعلق کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت انسان

کے اپنے کردار اور عمل کی ہے۔

قرآن کی اس آیت کا مطالعہ تو آپ کر ہی چکے، اس موضوع پر بائبل کی آیات یہ ہیں؛

(اے بنی اسرائیل!) اگر تم میری شریعت پر چلو گے اور میرے احکام کو ماننے میں محتاط رہو گے تو میں تمہارے لئے بروقت بارش برساؤں گا، زمین اپنی پیداوار دے گی اور میدان کے درخت اپنے پھل دیں گے۔۔۔ تم اپنے ملک میں حفاظت سے بسے رہو گے اور میں ملک میں امن بخشوں گا۔ تم سوؤ گے اور کوئی تمہیں پریشان نہ کرے گا۔ میں جنگلی درندوں کو تمہارے ملک سے بھگادوں گا۔ تلوار تمہارے ملک میں نہ چلے گی۔ تم اپنے دشمنوں کا تعاقب کرو گے اور وہ تمہارے آگے تلوار سے مارے جائیں گے۔ تمہارے پانچ آدمی سو کو اکھاڑ پھینکیں گے اور تمہارے سو آدمی دس ہزار پر غالب آئیں گے۔۔۔۔

اگر تم میری نہ سنو گے۔۔۔ میرے عہد کی خلاف ورزی کرو گے تو میں ناگہانی دہشت، گھلا دینے والی بیماریوں اور بخار کو تم پر بھیجوں گا جو تمہاری بینائی سلب کر لیں گے اور تمہاری جان لے لیں گے۔ تم بیکار بیج بوؤ گے کیونکہ ان کا پھل تمہارے دشمن کھائیں گے۔ میں تمہارا مخالف ہو جاؤں گا اور تم اپنے دشمنوں سے شکست کھاؤ گے۔۔۔ میں تمہارے اوپر آسمان کو لوہے اور نیچے زمین کو کانسی کی بنا دوں گا (یعنی تمہیں ان سے فائدہ حاصل نہ ہو گا)۔ زمین تمہیں پیداوار نہ دے گی اور نہ ملک کے درخت تمہیں فائدہ دیں گے۔۔۔ میں تمہارے خلاف جنگلی درندوں کو بھیجوں گا، وہ تمہارے بچوں کو اٹھا لے جائیں گے اور تمہارے مویشیوں کو تباہ کر دیں گے۔۔۔۔۔ میں تمہارے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دوں گا۔۔۔ تمہیں قوموں میں منتشر کر دوں گا۔۔۔۔ تم اپنے دشمنوں کے ملکوں میں رہو گے۔۔۔۔ جب تک وہ دشمنوں کے ملک میں رہیں گے، میں ان کو بالکل مسترد نہ کروں گا اور نہ ہی ان کے ساتھ ایسی نفرت کروں گا کہ ان کے ساتھ اپنے عہد کو توڑ کر انہیں فنا کر دوں۔ میں خداوند ان کا خدا ہوں۔ (کتاب

احبار، باب 26)

امن اور اقتصادی ترقی

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَداً آمِناً وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنْ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُمْ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلاً ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَى عَذَابِ النَّارِ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (البقرة2: 126)

یاد کرو جب ابراہیم نے دعا کی، "اے میرے رب! اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں انہیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔" جواب میں اس کے رب نے فرمایا، "اور جو نہ مانے گا، میں اسے بھی (دنیا کی چند روزہ زندگی کا) تھوڑا سامان دوں گا، مگر آخر کار اسے عذاب جہنم کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے۔"

سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام نے یہ دعا عرب کے شہر مکۃ المکرمۃ کے بارے میں کی۔ یہ شہر آپ نے اپنے بیٹے سیدنا اسماعیل علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ آباد فرمایا۔ ساڑھے چار ہزار سال سے یہ شہر اسی طرح آباد ہے اور اس طویل تاریخ میں دو تین واقعات کے استثنا کے ساتھ یہ شہر امن کا شہر رہا ہے۔ اس امن نے اس شہر کو اقتصادی اعتبار سے خوشحال ترین بنا دیا۔ بے آب و گیاہ وادیوں پر مشتمل اس شہر میں ہر طرح کا رزق اس کثرت سے دستیاب ہے جو شاید ہی دنیا کے کسی شہر میں

میسر آ سکے۔ایسا صرف آج کل ہی نہیں ہے بلکہ ساڑھے چار ہزار سال سے یہ شہر اسی خوشحالی سے متمتع ہو رہا ہے۔

اس دعا سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام امن کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔دنیا کے کسی بھی ملک یا شہر کی معاشی اور تمدنی ترقی کا انحصار امن پر ہے۔آج بھی اگر دنیا کے نقشے پر نظر دوڑائی جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ دنیا میں وہی ملک ترقی یافتہ کہلائے جاتے ہیں جہاں طویل عرصے سے امن قائم ہے۔اس کے برعکس ایسے ممالک جہاں بدامنی، قتل و غارت، دہشت گردی، منشیات فروشی، خانہ جنگی اور اسٹریٹ کرائم زیادہ ہیں وہ اقتصادی اور تمدنی اعتبار سے پس ماندہ کہلاتے ہیں۔

امن ایسی چیز ہے جس کے لئے ہزاروں مفادات اور مسائل کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ہمارے ہاں عجیب بات یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ہمارے نزدیک اہم ہے لیکن جس چیز کی اہمیت سے ہم ناآشنا ہیں وہ امن ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک اور شہر دنیا میں پس ماندہ اور طرح طرح کے مسائل کا شکار ہیں۔اگر ہم دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے ممالک کے لئے امن کی نہ صرف دعا کرنا ہو گی بلکہ دعا کے ساتھ ساتھ دوا یعنی عملی اقدام بھی کرنا پڑے گا۔

ہمیں ہر قیمت پر اپنے لئے امن خریدنا ہو گا خواہ اس کے لئے ہمیں اپنے کتنے ہی انفرادی و اجتماعی مفادات کو قربان کرنا پڑے۔اس کے بغیر کبھی بھی دنیا میں ترقی کا ہمارا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو

سکے گا۔ اپنی انفرادی زندگی کی مثال کو سامنے رکھیے، جو لوگ لڑائی جھگڑوں میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہ مالی اعتبار سے کبھی آسودہ حال نہیں ہو پاتے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنے لئے امن کا انتخاب کرتے ہیں وہ مالی اعتبار سے چند سال ہی میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔

اس آیت میں ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ دنیا اللہ تعالی نے آزمائش کے اصول پر بنائی ہے اس وجہ سے یہاں ان لوگوں کو بھی اس دنیا کی قلیل متاع میں بھرپور حصہ دیا جاتا ہے جو خدا کے دین کے نظریاتی یا عملی اعتبار سے منکر ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالی اس چھوٹی سی محدود دنیا میں اپنی اصل دنیا یعنی جنت کے باشندوں کا میرٹ پر انتخاب کر رہا ہے۔ اس میرٹ ٹسٹ میں جو کامیاب ہوئے انہیں اصل دنیا میں آباد کیا جائے گا جہاں نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہو گا اور نہ مستقبل کا اندیشہ۔ جو اس ٹسٹ میں فیل ہوئے انہیں بدترین ٹھکانہ نصیب ہو گا جہاں پچھتاووں اور اندیشوں کے سوا کچھ اور میسر نہ ہو سکے گا۔

مسلم، اسلام اور تعصب

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَقَ وَيَعْقُوبَ وَالأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ۔ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمْ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ (البقرة 2: 136-137)

کہو! ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسی، عیسی اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔ لہذا اطمینان رکھو کہ اللہ تمہاری حمایت کے لئے کافی ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

ہمارے دور میں لفظ "مسلم" ایک خاص قوم کے لئے بولا جاتا ہے جو دنیا میں انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک آباد ہے۔ اس قوم کے مذہب کو "اسلام" کہا جاتا ہے۔ یہ قوم اپنے بہت سے مسائل اور مفادات کے باعث دنیا کی دوسری قوموں سے مختلف میدانوں میں برسرپیکار ہے جس کے

باعث اس قوم میں اپنی قومیت اور مذہب کے بارے میں ایک خاص تعصب پیدا ہو چکا ہے۔ اس تعصب کا لازمی نتیجہ ہے کہ دوسری قومیں اس "مسلم" قوم اور اس کے مذہب "اسلام" کے بارے میں تعصب میں مبتلا ہوں۔

قرآن مجید اس سے بالکل مختلف ایک دوسری بات کہہ رہا ہے۔ قرآن کے نزدیک "مسلم" کوئی خاص قوم نہیں بلکہ اس کا معنی ہے "اللہ کا فرمانبردار"۔ اسی طرح "اسلام" کسی خاص قوم کے محدود سے مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے "اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری"۔ جو لوگ قرآن مجید کی دعوت پر ایمان لائیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے قومی اور مذہبی تعصبات کو چھوڑ کر خالصتاً اللہ کے آگے سر جھکانے اور اطاعت کا رویہ اختیار کریں۔

جب کوئی متعصب قوم تشکیل پاتی ہے تو اس کے کچھ افراد ہیرو قرار پاتے ہیں۔ یہ ہیرو اپنی قوم کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دے چکے ہوتے ہیں لیکن دوسری قوموں کے نزدیک ان کی حیثیت محض ایک ولن کی ہوا کرتی ہے۔

قرآن مجید تمام تعصبات کا خاتمہ کرتے ہوئے اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے دیا گیا دین ایک ہی تھا۔ یہی دین تھا جو سیدنا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، موسی اور عیسی علیہم الصلوۃ والسلام کو دیا گیا اور یہی دین اب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے۔ یہ تمام ہستیاں جو دنیا کے دیگر مذاہب کے پیروکاروں بالخصوص یہودیوں اور عیسائیوں کے لئے ہیرو کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ قرآن کے ماننے والے مسلمانوں (یعنی فرمانبرداروں) کے لئے بھی ہیرو ہی ہیں۔

مسلم کہلانے والوں پر یہ لازم ہے کہ وہ ان ہستیوں پر ایمان لانے اور ان کا ادب و احترام کرنے میں کوئی فرق روا نہ رکھیں۔

اگر غور کیا جائے تو لفظ اسلام اور مسلم ہر قسم کے تعصب کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور انسانیت و خدا پرستی کی بنیاد پر لوگوں کو جمع کرتے ہیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انسانیت کو تقسیم کرنے کا کام کرتے ہیں۔ "خدا پرستی" ایسی دعوت ہے جو تعصبات سے بالاتر ہو کر انسانیت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکتی ہے۔

امت وسط اور قبلے کی تبدیلیاں

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلاَّ لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلاَّ عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ۔ (البقرة2: 143)

اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر حق کی گواہی دو اور رسول تم پر حق کے گواہ بنیں۔ پہلے تم جس طرف رخ کرتے تھے اس کو تو ہم نے یہ آزمانے کے لئے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے رخ اپنی ایڑیوں پر پھر جاتا ہے۔ یہ معاملہ تھا تو بڑا سخت مگر ان لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت نہ ثابت ہوا جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے۔ اللہ تمہارے اس ایمان کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ یقین جانو کہ وہ لوگوں کے حق میں بہت مہربان اور ابدی شفقت والا ہے۔

اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل عرب پر اللہ کی حجت پوری کر دی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر اللہ کے گواہ ہوئے۔ اہل عرب کی اکثریت جو سیدنا اسماعیل علیہ الصلوۃ والسلام کی اولاد تھی، انہوں نے حق اور انصاف پر قائم ہوتے ہوئے اس وقت کی متمدن دنیا کے بڑے حصے

پر اللہ کی حجت کو پورا کر دیا۔ پوری نسل انسانی میں سے جس کا جی چاہے وہ تاریخ کے اس روشن عہد کو دیکھ کر یہ جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام نسل انسانیت کے لئے کیا ہے؟ اس طریقے سے قدسیوں کا یہ گروہ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عام انسانوں کے درمیان ایک درمیانی گروہ یا امت وسط کی شکل اختیار کر گیا۔

مسند احمد کی ایک حدیث کے مطابق قیامت میں سیدنا نوح علیہ الصلوۃ والسلام کی امت قیامت کے دن یہ عذر پیش کرے گی کہ ان کے پاس اللہ اور یوم آخرت کے بارے میں کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا۔ اس وقت گواہی کے لئے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو پیش کیا جائے گا۔

اولاد ابراہیم کے علاوہ آسٹریلیا، چین، روس، ہندوستان، یورپ اور امریکہ میں پھیلی پوری نسل انسانیت سیدنا نوح علیہ الصلوۃ والسلام کی امت ہی تو ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت نے معجزانہ طور پر چند ہی سال میں متمدن دنیا کے بڑے حصے کو فتح کر کے یہاں جو خدا پرستانہ معاشرے قائم کیے، یہ پوری نسل انسانیت کو قیامت تک اللہ اور یوم آخرت کی یاد دلاتے ہیں۔ اسی اعتبار سے انہیں امت وسط کہا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تخلیقی پلان کے مطابق عالم انسانی کی یہ ضرورت ہے کہ اس کے درمیان ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو انسانوں کو خدا کے اس تخلیقی پلان کے بارے میں خبردار کرتے رہیں۔ اسی مشن کے تحت اللہ اپنے رسول اور نبی بھیجتا رہا۔ یہ سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔

اب یہ ذمہ داری امت محمدی کو دی گئی کہ وہ خدا کے اس پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچاتے رہیں۔ سورۃ توبہ کے آخر میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ دین میں گہری بصیرت حاصل کریں اور اپنی اپنی اقوام کو اللہ اور آخرت کے بارے میں خبردار کریں۔

اولاد ابراہیم کی ایک شاخ بنی اسرائیل کے لئے نمازوں کا قبلہ یروشلم کی مسجد کو مقرر کیا گیا تھا اور بنی اسماعیل کے لئے یہی حیثیت مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ کو حاصل تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ دونوں اقوام اپنے قبلوں کے بارے میں تعصب کا شکار ہو چکی تھی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مدینہ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا قبلہ بیت المقدس کو بنا لیں۔ یہ ان کے تعصبات پر کاری ضرب تھی لیکن یہ لوگ اس امتحان میں پورا اترے۔ اس کے کچھ عرصے بعد مکہ کی مسجد الحرام کو قبلہ مقرر کیا گیا۔ یہ بنی اسرائیل کے تعصبات پر کاری ضرب تھی۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ قبلے کی یہ تبدیلیاں محض آزمائش تھیں تا کہ یہ سامنے آجائے کہ کون اللہ کے رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اپنے تعصب کا شکار ہو کر رسول اللہ کی پیروی سے انکار کرتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین میں قومی تعصبات کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کا دین انسان کو تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر خالصتاً اللہ اور اس کے رسول کا پیروکار بننے کی تلقین کرتا ہے۔

شخصیت کی تعمیر کیسے کی جائے؟

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولاً مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمْ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۔ (البقرة 2: 151)

جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہاری شخصیت کو (عیوب سے) پاک کرتا ہے، اس کے لئے تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ہدایت عطا کرنے کے لئے ان میں اپنے رسول بھیجے۔ یہ رسول جو مشن لے کر آتے تھے وہ قرآن کی اصطلاح میں "تزکیہ نفس" یعنی تعمیر شخصیت کہلاتا ہے۔ تزکیہ نفس کا معنی یہ ہے کہ انسانی شخصیت کو نظریاتی، اخلاقی اور عملی آلائشوں سے پاک کر کے اس میں ایسی اسپرٹ پیدا کر دی جائے کہ اس کی پوری شخصیت تبدیل ہو کر ایک اچھے انسان میں بدل جائے۔ وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کی بجائے ان کے لئے نفع بخش بن جائے۔ اس تبدیلی شخصیت کے لئے جو لائحہ عمل قرآن نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

- اللہ کی آیتوں کی تلاوت کر کے انسان کو اس کے آگے جھکنے اور اس کا فرمانبردار بندہ بننے

کے لئے اسے تیار کیا جائے۔

- اس کی شخصیت کو آلائشوں سے پاک کرنے کے لئے اسے "الکتاب" اور "الحکمۃ" کی تعلیم دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے جو دین رسولوں کی وساطت سے انسانوں کو دیا ہے وہ "الکتاب" اور "الحکمۃ" پر مشتمل ہے۔ "الکتاب" دراصل کچھ قواعد و ضوابط اور قوانین کا مجموعہ ہے۔ یہ قوانین اپنی روح میں تو تمام امتوں کے لئے یکساں ہی رہے ہیں البتہ وقتی تقاضوں کے باعث ان کی ظاہری شکل و صورت میں معمولی تبدیلیاں کی جاتی رہی ہیں۔ تورات بالعموم انہی قوانین کا بیان ہے اسی وجہ سے سورۃ مائدہ میں تورات کو "الکتاب" کہا گیا ہے۔

ان قوانین کے علاوہ جو چیز اللہ کی جانب سے دی گئی ہے وہ "الحکمۃ" ہے۔ حکمت دراصل انسان کے عقائد و نظریات اور اس کے اخلاق سے متعلق ہے۔ انسان کے خیالات اور اس کا عمل بہت سی گندگیوں اور آلائشوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ خدا کی حکمت اسے ان آلائشوں سے پاک کرتی ہے۔ انجیل میں اسی حکمت کو بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ مائدہ میں انجیل کو "الحکمۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے۔ یہ اسی "الکتاب" یعنی شریعت اور "الحکمۃ" یعنی ایمان و اخلاق کا جامع بیان ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت امت میں جاری کی ہے وہ بھی انسان کے جسم اور روح کو ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک کرنے کا کام کرتی ہے۔ احادیث میں بیان کردہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت کا اگر مطالعہ کیا جائے تو وہ اسی کتاب و حکمت کی تعلیم پر مشتمل نظر آتی ہے۔

انسانی شخصیت کو تعمیر کرنے کا پیغمبرانہ طریقہ یہی ہے کہ انسانوں کو کتاب و حکمت یعنی اللہ کی شریعت، ایمان اور اخلاقیات کی تعلیم کے ذریعے ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک کیا جائے۔ نبوت کے ختم ہونے کے بعد یہی فریضہ اہل علم و دانش کے سپرد ہے جو قیامت تک ان کی ذمہ داری ہے۔ دعوت دین کے نام پر جتنی بھی کاوشیں دنیا میں جاری ہیں وہ کتاب و حکمت کی اسی تعلیم پر مشتمل ہیں۔ اگر ہم اپنی شخصیت کی تعمیر کرنا چاہیں تو ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم اسی کتاب اور حکمت کی تعلیم حاصل کریں۔

ذکر، شکر، صبر اور نماز

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلا تَكْفُرُونِ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۔ (البقرة153-152 :2)

پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میرا شکر ادا کرو اور کفران نعمت نہ کرو۔ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا آزمائش کے اصول پر بنائی ہے۔ جیسے امتحان میں ایک طالب علم کو کچھ مشکل اور کچھ آسان سوالات دیے جاتے ہیں ویسے ہی اس زندگی میں انسان کو مشکل اور آسان دونوں طرح کے ٹسٹ پیش آتے ہیں۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے رب کو یاد رکھے۔ اس یاد کو قائم رکھنے کا سب سے اعلیٰ ترین ذریعہ نماز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی یاد کو قائم رکھنے کے لئے بہت سے اذکار اور دعائیں تلقین فرمائی ہیں۔ اللہ کو یاد رکھنے کا انعام انسان کو یہ ملتا ہے کہ اس کا رب اسے یاد رکھتا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان کے لئے اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ اس کا رب اسے یاد کرتا ہو۔

دنیا میں انسان کو جو آسان اور مشکل ٹسٹ در پیش آتے ہیں، ان میں اس کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

قرآن مجید اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ آسانی کی حالت میں اسے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر رہنا چاہیے اور مشکل حالات میں اسے صبر سے کام لینا چاہیے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا پوری دنیا اس کی مخالف ہو گئی ہے، اسے ہر روز ایک نئے چیلنج سے گزرنا پڑ رہا ہے، روز ہی اس پر ایک نئی آفت ٹوٹ پڑ رہی ہے، اپنے بھی اس کے دشمن ہو گئے ہیں اور زندگی ایک عذاب مسلسل بن چکی ہے۔ یہ صورتحال افراد کو بھی پیش آ سکتی ہے اور اقوام کو بھی۔ اگر آپ اپنی زندگی کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو گی کہ یہ صورتحال انسان کو مسلسل پیش نہیں آتی۔ جب انسان ان مشکل حالات سے گزر رہا ہوتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہے گا۔ ایسے موقع پر بعض لوگ واویلا شروع کر دیتے ہیں اور آہ و فغاں سے گویا آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اگر کوئی مصیبت اجتماعی طور پر وارد ہوئی ہے تو لوگ رد عمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہنگامے، توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کے ذریعے دوسروں کی زندگی تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن مجید ایسے حالات میں انسان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ صبر سے کام لے۔ صبر کو ایک منفی عمل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ایک نہایت ہی مثبت عمل ہے۔ جب انسان صبر کے اس امتحان میں پورا اترتا ہے تو پھر خدائی قوتیں اس کی حمایت میں اتر آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ایسے حالات پیدا کر دیتا ہے کہ مشکلات آسان ہونے لگتی ہیں اور آہستہ آہستہ انسان حالات کے گرداب سے نکل آتا ہے۔

دوسری طرف ہمارے ہاں یہ عام خیال کیا جاتا ہے کہ آنسو کا آ جانا صبر کے منافی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ دکھ یا غم میں آنسو آ جانا فطرت و رحم کی وجہ سے ہے جو اللہ نے انسان کے دل میں ڈال رکھا ہے۔ (صحیح بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی کو بھی یہی صورتحال بارہا پیش آئی۔ ایسے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو رویہ اختیار فرمایا وہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ مشکل حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے اور نماز ادا کرتے۔ اولاد کی وفات کا صدمہ ہو یا نادان مخاطبین کی جانب سے پتھراؤ، منافقین کی ریشہ دوانیاں ہوں یا کفار کے حملے، ان سب حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حضور جا کھڑے ہوتے اور نماز سے مدد طلب کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مشکلات کو دور فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہو سلم کی عظیم جدوجہد کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پوری دنیا میں پھیل گیا۔

صبر کے امتحان میں انسان کو آزمانے کے بعد اسے ایک اور طرح کے امتحان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا گویا اس کی موافق ہو چکی ہے، وہ جس طرف جاتا ہے کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، ہر روز اسے کوئی اچھی خبر سننے کو ملتی ہے، دن بدن وہ ایک نئی منزل دریافت کرتا ہے اور حالات اس کے حق میں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ صورتحال افراد کو بھی پیش آتی ہے اور قوموں کو بھی۔ بعض نادان لوگ ایسے موقع پر اپنی حدود سے نکل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں بالخصوص شراب و شباب کے ذریعے خوشی منانے لگتے ہیں۔ وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں

کہ یہ خوشیاں ہمیں اپنی کاوشوں سے حاصل ہوئی ہیں۔

قرآن مجید اس معاملے میں بھی ہماری راہنمائی کرتا ہے اور ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ایسے موقع پر ہمیں اپنے رب کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ان نعمتوں کو اللہ کی جانب سے سمجھتے ہوئے اس کی نافرمانی اور کفران نعمت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ہمیں اسی کی راہنمائی ملتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی خوشی ملتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رد عمل میں اپنے رب کے حضور نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور اپنے رب کا شکر ادا کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غالباً سب سے بڑی خوشی اس وقت ملی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم فوج کی قیادت کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔ اس موقع پر کسی غرور و تکبر اور شان و شوکت کے اظہار کی بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر اپنے رب کے حضور اس قدر جھکا ہوا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک اونٹ کے کوہان سے ٹکرا رہا تھا۔

صبر اور شکر کی ان آزمائشوں سے وہی لوگ کامیابی سے گزرتے ہیں جو اپنے رب کو یاد رکھتے ہیں اور اس یاد کے لئے نماز قائم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

کائنات کی نشانیاں اور سائنس

وَإِلَهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لا إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ۔ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنْ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔ (البقرة 2: 163-164)

تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے، اس رحمان ورحیم کے علاوہ کوئی اور خدا نہیں ہے۔ (اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے اگر تمہیں کوئی نشانی درکار ہو تو) کوئی شک نہیں کہ آسمان وزمین کی ساخت میں، رات اور دن کے مسلسل ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے سمندروں میں چلتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ بلندی سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اسی سے زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوقات پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش اور ان بادلوں میں جو زمین اور آسمان کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھ دیے گئے ہیں، نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

یہ کائنات اندھی قوتوں کے کسی عمل سے وجود میں نہیں آئی۔ اس کائنات کو ایک ایسی ہستی نے

تخلیق کیا ہے جو نہایت ہی باتدبیر ہے۔ وہ ہستی صرف اور صرف ایک ہی ہے۔ یہ مذہب کا بنیادی مقدمہ ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس تک انسان اس کائنات ہی میں غور و فکر کر کے پہنچ سکتا ہے۔ ان آیات میں چند چیزوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیئے ان میں غور و فکر کریں:

آسمان و زمین کی ساخت

یہ کائنات چھوٹے بڑے بہت سے اجسام پر مشتمل ہے۔ ان اجسام میں بعض ایسے ہیں جو خود روشن ہیں، یہ ستارے (Stars) کہلاتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو ان ستاروں سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ انہیں سیارے (Planets) کہا جاتا ہے۔ سیارے عام طور پر کسی خاص ستارے کے گرد گردش کرتے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ستارے مل کر ایک کہکشاں (Galaxy) بناتے ہیں۔ کائنات میں کروڑوں کہکشائیں ہیں جو مسلسل گردش میں ہیں۔

یہ کائنات اتنی بڑی ہے کہ اس کے فاصلوں کی پیمائش نوری سالوں میں کی جاتی ہے۔ ایک نوری سال وہ فاصلہ ہے جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ ایک نوری سال تقریباً 9,460,800,000,000 کلو میٹر کے برابر ہوتا ہے۔ اس فاصلے کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کے تیز ترین جیٹ جہاز کو بھی یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے تقریباً ساڑھے تیرہ لاکھ سال درکار ہوں گے۔ اس کائنات میں ایسے ستارے بھی ہیں جو زمین سے لاکھوں نوری سالوں کے فاصلے پر واقع ہیں۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں نوری سالوں کے فاصلوں پر مشتمل اس

پوری کائنات کو پہلا آسمان کہا جاتا ہے۔ انسان ابھی تک اپنی پوری ترقی کے باوجود اتنی ہی کائنات دریافت کر سکا ہے۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ اس طرح کی چھ کائناتیں اور بھی موجود ہیں۔

یہ ستارے، سیارے اور کہکشائیں حرکت کر رہے ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سب کسی ذہین اور جاندار مادے سے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ یہ سب کے سب بے جان مادے پر مشتمل ہیں۔ ذرا تصور کیجیے کہ اگر دس پندرہ موٹر کاروں کو بغیر ڈرائیوروں کے حرکت میں لا کر چھوڑ دیا جائے تو کیا ہو گا۔ تجربے کے طور پر آپ بچوں کی کھلونا کاروں کے ساتھ یہی معاملہ کر کے نتیجہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ یہاں دس پندرہ نہیں بلکہ کروڑوں اربوں بے جان اجسام بے پناہ رفتار سے حرکت کر رہے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اربوں کی تعداد میں حرکت کرتے ہوئے یہ اجسام ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیوں نہیں ہوا؟اس کے جواب پر غور فرمائیے۔ اگر یہ کائنات کسی اندھے اصول پر خود بخود وجود پذیر ہوئی ہوتی تو ایسا ہو جانا چاہیے تھا لیکن ایسا ہوا نہیں!!!!آخر کیوں؟؟؟؟

سائنس دان یہ بیان کرتے ہیں کہ ان اجسام کی رفتار اور ان کے مابین کشش میں اتنا کامل (Perfect) تناسب موجود ہے کہ اگر رفتار کچھ زیادہ ہی ہو جائے تو یہ ستارے و سیارے گردش کرنے کی بجائے سیدھے نکل جائیں اور اگر کچھ کم ہو جائے تو کشش کے باعث ایک دوسرے سے جا ٹکرائیں۔ اتنا ناپ تول کر ان کی رفتار اور کشش کی قوت کس نے معین کر دی؟؟؟؟ کیا کسی اندھی قوت نے؟؟؟

اب آسمان سے اتر کر زمین پر آئیے۔ یہ زمین اسی کائنات کا ایک حصہ ہے جسے اگر سائز کے اعتبار

سے دیکھا جائے تو اس کی بظاہر کوئی حیثیت نظر نہیں آتی۔ایسی تیرہ لاکھ زمینیں تو محض ایک سورج سے ہی نکل سکتی ہیں۔سائز کو نظر انداز کر کے اگر ایک اور پہلو سے دیکھیے تو یہ زمین ایک غیر معمولی حیثیت کی حامل ہے۔دوسرے سیارے اور ستارے جن عناصر (Elements) سے مل کر بنے ہیں، زمین بھی انہی پر مشتمل ہے لیکن ان عناصر کی ترکیب (Composition) ایسی ہے جس کی بدولت زمین زندگی کے لئے موزوں ترین ہے۔

اس زمین پر آکسیجن موجود ہے جس کی اتنی بڑی مقدار ابھی تک کسی اور سیارے پر دریافت نہیں ہوئی۔اس آکسیجن کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔یہ آکسیجن زمین کے فضائی دائرے میں بیس اکیس فیصد کے تناسب سے موجود ہے۔سائنس دان بتاتے ہیں کہ اگر یہ تھوڑی سی زیادہ ہو جاتی تو ہر چیز جلدی جلدی آگ پکڑنے لگتی۔اگر یہ کم ہوتی تو جاندار اشیا کو پوری طرح میسر ہی نہ آتی اور زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔اگر یہ زمین بغیر کسی خالق کے خود بخود ہی بنی ہوئی ہے تو اتنا ناپ تول کر اس میں آکسیجن رکھنا کم از کم میری سمجھ سے تو باہر ہے۔

اس زمین کا سورج سے فاصلہ بھی ایک عجیب فاصلہ ہے۔زمین کو توانائی پہنچانے کا بنیادی ذریعہ سورج ہے جو زمین سے 1,496,000 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔اگر یہ فاصلہ کچھ کم ہو جاتا تو ہم لوگ شدید گرمی سے جل بھن کر کباب ہو جاتے اور اگر کچھ زیادہ ہو جاتا تو ٹھٹھر کر مر جاتے۔بڑی پیمائش سے یہ فاصلہ کیسے رکھ دیا گیا؟؟؟؟ یہ کم یا زیادہ کیوں نہیں ہوتا؟؟؟؟

گوگل کارپوریشن نے گوگل ارتھ کے نام سے جو سافٹ ویئر بنایا تھا، حال ہی میں اس میں گوگل

اسکائی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ اب ہم زمین کے ساتھ ساتھ آسمان اور اس کے اجرام فلکی کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ www.earth.google.com سے اس سافٹ وئیر کو ڈاؤن لوڈ کر کے اس کائنات کو ایکسپلور کر کے ذرا اس میں غور فرمایئے۔

رات اور دن کی گردش

یہ زمین اپنے محور کے گرد گردش میں ہے۔ اس کا جو حصہ سورج کے سامنے آجاتا ہے وہاں دن نکل آتا ہے اور جو حصہ سورج سے دور ہوتا ہے وہاں رات ہو جاتی ہے۔ اگر زمین گیند کی طرح گول ہونے کی بجائے تھالی نما ہوتی تو اس کا ہر حصہ فوراً فوراً سورج کے سامنے آتا رہتا اور مسلسل دن کی سی کیفیت رہتی۔ اسی طرح اگر زمین گردش نہ کر رہی ہوتی تو اس کا ایک حصہ مسلسل روشنی میں اور دوسرا مسلسل تاریکی میں رہتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر مسلسل دن رہنے کے باعث زمین کا ایک حصہ حرارت جذب کر کر کے اتنا گرم ہو جاتا کہ وہاں زندگی ممکن نہ ہوتی اور دوسرے حصے میں مسلسل رات رہنے کے باعث اتنی سردی ہو جاتی کہ وہاں بھی کوئی زندہ نہ رہ پاتا۔ دن اور رات کی اس گردش کو کیوں قائم کیا گیا اور یہ کیسے ہوا؟؟؟؟

زمین کی گردش کی رفتار بھی بڑی عجیب ہے۔ اگر موجودہ رفتار کی بجائے یہ کچھ تیز ہو جاتی تو دن اور رات جلدی جلدی آنے لگتے اور ہمیں اتنی حرارت ہی نہ مل پاتی جتنی ہمیں چاہیے۔ اگر یہ رفتار کچھ سست ہو جاتی تو دن بہت طویل ہونے کے باعث بہت گرم ہو جاتا اور رات بھی نہایت طویل ہونے

کے باعث ضرورت سے زیادہ سرد ہو جاتی۔ زمین کی رفتار کو اتنا منظم کر دیا گیا ہے کہ کروڑوں سالوں سے یہ اتنی ہی ہے جتنی ضرورت ہے۔ اتنی پیمائش کے ساتھ اس رفتار کو متعین کرنا کس کے بس کی بات ہے؟؟؟؟ کیا کوئی اندھی قوت ایسا کر سکتی ہے؟؟؟؟

سمندر، دریا اور بحری جہاز

سمندروں اور ان میں چلنے والے چھوٹے بڑے بحری جہازوں اور کشتیوں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ انسان نے فضائی راستے تو ابھی ایک صدی پہلے ہی دریافت کئے ہیں۔ زمینی راستوں کا عالم یہ رہا ہے کہ سارا سال دنیا کے ایک خطے میں بسنے والے انسانوں کو دوسروں سے ملانے میں یہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ دور قدیم سے انسانوں کو ایک دوسرے سے ملانے میں کلیدی کردار بحری راستوں کا ہے۔

یہ زمین کچھ اس طرح کی بنی ہوئی ہے کہ اس کے ہر حصے پر انسان کی ضرورت کی ہر چیز پیدا نہیں ہوتی۔ ایک جگہ پر ایک چیز پیدا ہوتی ہے اور دوسری جگہ پر دوسری۔ مختلف اقوام کی صلاحیتیں اور مہارتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتی ہیں۔ ایک قوم کسی ایک چیز میں ماہر ہوتی ہے اور دوسری کسی اور چیز میں۔ ایک خطے میں ایک چیز یا خدمت کی پیداواری لاگت (Cost of Production) کم ہوتی ہے اور دوسرے حصے میں دوسری چیز کی۔ انسان کو لازماً دنیا کے دوسرے حصوں میں بسنے والے انسانوں سے رابطہ رکھنا پڑتا ہے تاکہ ضرورت کی اشیاء اور خدمات کا

تبادلہ کیا جاسکے۔اسی کو معاشیات میں Law of Comparative Advantage کہا جاتا ہے۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ زمین میں یہ مسئلہ رکھ کر اسے ایسے ہی چھوڑ نہیں دیا گیا بلکہ انسان کو یہ سکھا دیا گیا کہ وہ پانی کی مدد سے کیسے نقل و حرکت کر کے دنیا کے ایک خطے سے دوسرے خطے پر جا سکتا ہے۔ایسا طبیعات (Physics) کے ایک قانون فطرت کے تحت ممکن ہو سکا ہے۔

اس قانون کے تحت ایسے مادے جن کی کثافت (Density) پانی سے کم ہوتی ہے، پانی پر تیرتے ہیں اور جن کی کثافت پانی سے زیادہ ہوتی ہے وہ اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ نسبتاً لطیف چیزیں اوپر اٹھتی ہیں اور کثیف چیزیں نیچے بیٹھتی ہیں۔اس کے پیچھے دراصل کشش ثقل کا قانون کارفرما ہے۔ لکڑی کی کثافت چونکہ پانی سے کم ہے اس لئے یہ نہ صرف پانی پر تیرتی ہے بلکہ اس پر اگر کچھ اور بھی رکھ دیا جائے تو یہ اسے بھی اپنے ساتھ تیرا لیتی ہے۔اسی قانون کے تحت انسان نے کشتی اور بحری جہاز بنائے جن کی بدولت دنیا کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں اس کی نقل و حرکت دور قدیم ہی میں ممکن ہو سکی تھی۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو فزکس کا یہ قانون کثافت اور اکنامکس کا لاء آف کمپیریٹو ایڈوانٹج ایک دوسرے کے سپلیمنٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ایک قانون کے بغیر دوسرا بے معنی ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں اور انسانی ضروریات کو پورا کرتے ہیں اور اسی کی بدولت دنیا میں تمدن وجود میں آتا ہے۔اقوام وجود پذیر ہوتی ہیں، ہر قوم مخصوص مختلف اشیاء اور خدمات میں

اسپیشلسٹ بنتی ہے، قومیں ایک دوسرے سے اشیاء و خدمات کا تبادلہ کرتی ہیں، ان کے درمیان تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اس طرح سے تمدن ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ دنیا ایسے جزیروں پر مشتمل ہوتی جہاں کے رہنے والے کبھی دوسروں سے نہ ملے ہوتے تو تمدن کی یہ ترقی جس پر ہم فخر کرتے ہیں کبھی وجود پذیر نہ ہوتی۔ مثال کے طور پر امریکا کے ریڈ انڈینز اور آسٹریلیا کے ایب اوریجینز پر غور کیجیے۔

کائنات میں ایک اور قانون کارفرما ہے اور وہ ہے بے ترتیبی کا قانون۔ اگر اس دنیا کی چیزوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو یہ منتشر اور بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔ بغیر باغبان کے باغ بے ترتیب ہو کر اجڑ جاتے ہیں، بغیر گاڑی بان کے گاڑیاں ٹکرا کر تباہ ہو جاتی ہیں، بغیر حکمران کے انسان انتشار اور بدامنی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کائنات کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی ذہین قوت ایسی ہونی چاہیے جو چیزوں کو منظم کرنے کا فریضہ انجام دے سکے۔

جب یہ زمین تخلیق ہوئی، اس میں لاء آف کمپیریٹو ایڈوانٹج کے ساتھ ساتھ لطیف اشیاء کے تیرنے کا قانون بھی رکھ دیا گیا۔ اگر زمین کی تخلیق میں ایک مسئلہ ہو گیا تھا تو دوسرے طریقے سے اسے حل کیسے کر دیا گیا؟ بے ترتیبی کے قانون کے تحت ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس زمین کے ڈیزائن میں بھی ایسی ہی بے ترتیبی ہوتی لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اس زمین کی تخلیق میں ایسی ترتیب ہے کہ اگر ایک مسئلہ ہے تو اس کا حل بھی ہے اور وہ مسئلہ بجائے خود کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسانی تمدن کی بنیاد ہے۔ ایسا کیوں ہوا، کیسے ہوا اور کس نے کیا؟؟؟؟

واٹر سائیکل

اس زمین میں زندگی کے لئے پانی ناگزیر ہے۔ پانی کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زمین پر زندگی اسی وجہ سے ہے کہ یہاں 70% حصے پر پانی موجود ہے۔ انسان جانداروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو پانی کی بجائے خشکی پر رہتے ہیں لیکن پانی انسان کی بھی اہم ترین ضرورت ہے۔ انسان کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ وہ سمندر کا پانی استعمال نہیں کر سکتا کیونکہ یہ انتہائی نمکین ہے۔ اپنی بہت سی ضرورتوں کے باعث انسان کو زمین میں بکھر کر رہنا پڑتا ہے جہاں تک پانی پہنچانا اس کی ضرورت ہے۔

موجودہ دور میں اس مسئلے کو اس طریقے سے حل کیا گیا ہے کہ سمندری پانی کو صاف کر کے پہلے قابل استعمال بنایا جاتا ہے اور پھر اسے بڑی بڑی موٹروں کے ذریعے پمپ کر کے پائپ لائنوں کے ذریعے سمندر سے دور دراز علاقوں تک لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ کارنامہ جدید انسان نے اپنی سائنسی ترقی کے باعث انجام دے لیا ہے لیکن اب سے سو سال پہلے کے انسان کے لئے تو یہ ممکن نہ تھا۔ پھر اس طریق کار پر اتنے وسائل صرف ہو جاتے ہیں کہ صاف سمندری پانی انتہائی مہنگا ہوتا ہے اور اگر اسے سمندر سے دور پہنچا لیا جائے تو اس میں ٹرانسپورٹیشن کے اخراجات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

اس زمین کے ڈیزائن میں اس مسئلے کا حل پہلے سے ہی موجود ہے۔ سورج کی حدت سے سمندر سے پانی بخارات بن کر اڑتا ہے اور بادلوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ پانی اسی مرحلے پر صاف اور انسان

کے لئے قابل استعمال ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد پمپنگ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہواؤں کی گردش کا ایک عجیب نظام بنایا گیا ہے جو اس پانی کو لے کر سمندر سے دور دراز مقامات پر چلا جاتا ہے اور وہاں بارش اور برف کی صورت میں برس پڑتا ہے۔

زمین کے ڈیزائن میں ایک اور چیز رکھی گئی ہے کہ سمندر سے دور دراز مقامات بلند ہوتے ہیں اور سمندر نشیب میں واقع ہے۔ کشش ثقل کا قانون بھی بنا دیا گیا ہے جس کے باعث پانی اوپر سے نیچے آتا ہے۔ سورج کی حدت سے برف پگھلتی ہے، دریا بنتے ہیں، ان میں بارش کا پانی بھی شامل ہوتا ہے اور یہ پانی واپس سمندر کی طرف آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سارا عمل صدیوں کے تواتر سے جاری ہے اور واٹر سائیکل کہلاتا ہے۔

اسی واٹر سائیکل پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انسانوں اور دیگر جانداروں کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے زمین بھر میں جگہ جگہ اسٹور تیج ٹینک بھی بنا دیے گئے ہیں تاکہ اگر کبھی کسی اور مصلحت کے باعث اس واٹر سائیکل کی رفتار میں کمی بیشی کرنی پڑے تو اسٹور کیا ہوا یہ پانی انسان اور دیگر جانداروں کے کام آئے۔ یہ اسٹور تیج ٹینک آسمان پر بادلوں، برف پوش چوٹیوں پر گلیشیئرز، پہاڑوں اور میدانوں میں جھیلوں اور زیر زمین پانی کے ذخیروں کی شکل میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر ان سب ذخیروں میں موجود پانی کو اکٹھا کیا جائے تو شاید یہ مقدار میں سمندری پانی کے آس پاس ہی ہو۔ اس پر مزید اضافہ یہ کیا گیا ہے کہ انسان کو اتنی عقل دے گئی ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے لحاظ سے ان ذخیروں میں کمی بیشی کر سکتا ہے اور انہیں اپنے مفاد میں استعمال بھی کر سکتا ہے۔

ہم انسان بھی اپنی ضرورت کے تحت چھوٹے موٹے واٹر سائیکل بنا لیتے ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں گھروں میں کنویں موجود ہوتے ہیں، اس میں واٹر پمپ لگا کر پانی کو چھت پر ٹینکی میں پہنچایا جاتا ہے جہاں سے یہ واپس نلوں میں آجاتا ہے۔ شہروں میں یہ کام ذرا بڑے پیمانے پر کر لیا جاتا ہے۔ کیا آپ اس بات پر یقین کریں گے کہ کسی گھر میں ایک کنواں خود بخود ہی کھد گیا، اس میں واٹر پمپ بھی خود ہی آکر نصب ہو گیا، چھت پر ٹینکی بھی خود ہی بن گئی اور نل بھی خود ہی نصب ہو گئے اور پانی خود بخود بہنے لگا؟ اگر آپ اس بات پر یقین نہیں کرتے تو حیرت ہو گی اس بات پر کہ آپ اس بات پر یقین کر لیں کہ روئے زمین کا سب سے بڑا واٹر سائیکل جو سمندروں، بادلوں، ہواؤں، بارشوں، برف، جھیلوں، دریاؤں اور زیر زمین پانی کی شکل میں نہ صرف موجود ہے بلکہ پوری طرح رواں دواں ہے، وہ خود بخود ہی کچھ اندرونی قوتوں کے تحت وجود پذیر ہو گیا؟؟؟؟

ایکو سسٹم

اس واٹر سائیکل کا ایک اور حیرت انگیز نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ جہاں جہاں یہ پانی پہنچتا ہے وہاں وہاں زمین سے نباتات نکلنے لگتی ہیں۔ اس سے پہلے یہ زمین زندگی سے خالی ہوتی ہے۔ زمین کے اندر مختلف کیمیکل اور نمکیات رکھ دیے گئے ہیں۔ پانی اور ان کیمیکلز پر نشوونما پا کر پودے بڑے ہونے لگتے ہیں۔ ان نباتات کو جانور کھاتے ہیں اور پھر ان جانوروں کو بڑے جانور اور انسان کھا جاتے ہیں۔ یہ تمام پودے، جانور اور انسان بالآخر مر کر مٹی میں مل جاتے ہیں۔ ان کے جسم بے شمار کیمیکلز سے بنے ہوتے ہیں جو سب کے سب مٹی میں مل کر وہی کیمیکلز اور نمکیات پیدا کر دیتے ہیں جو پودوں کی

ضرورت ہیں۔ یہ پورا سائیکل ایکو سسٹم کہلاتا ہے اور بائیولوجی کی شاخ ایکولوجی کا موضوع ہے۔

ہمیشہ سے اس ایکو سسٹم میں ایک خاص تناسب موجود ہے۔ اگر اس سسٹم میں کوئی رخنہ پیدا کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں پورا ایکو سسٹم تباہ و برباد ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر پودوں کی کوئی قسم ختم ہو جائے تو اس کے نتیجے میں ان پر پلنے والے جانور بھی فنا ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں وہ جانور بھی مرنا شروع ہو جائیں گے جو ان جانوروں کو کھاتے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا اور انسانوں کی موت تک آ پہنچے گا۔ دور جدید میں انسان کی پھیلائی ہوئی صنعتی آلودگی کے باعث ایکو سسٹم پر جو مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں اس کے نتائج انسان تک پہنچنا بھی شروع ہو چکے ہیں۔

یہ پورا ایکو سسٹم اتنی ذہانت سے ڈیزائن کیا گیا ہے کہ اس کے نتیجے میں کروڑوں کی تعداد میں پودوں اور جانوروں کی نسلیں دنیا میں موجود ہیں۔ ایک دوسرے کو کھانے کے باوجود یہ جاندار ختم نہیں ہوتے اور یہ سلسلہ لاکھوں سال سے چلا آ رہا ہے۔ کیا اتنا خوبصورت ڈیزائن خود بخود تخلیق پا گیا؟؟؟؟

اہل عقل

ان آیات میں کائنات کی ان نشانیوں کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ نزول قرآن سے لے کر آج تک لوگ اپنے اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق ان نشانیوں پر غور کرتے آئے ہیں۔ ہمارے دور میں علم کی سطح قدیم ادوار کے مقابلے میں بہت بلند ہو چکی ہے جس کے باعث ہم ان نشانیوں میں اپنے آباؤ اجداد

کے مقابلے میں زیادہ گہرائی میں غور کر سکتے ہیں۔

درج بالا بحث میں، میں نے آپ کی خدمت میں جو سوالات رکھے ہیں، کوئی بھی عقل مند انسان ان کا ایک ہی جواب دے سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ پوری کائنات اور زمین پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے اور وہ صرف اور صرف ایک ہی ہے۔ جو انسان اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر پہنچتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس پورے نظام کا کوئی خالق نہیں اور یہ خود بخود ہی بن گئی، وہ ایسا اپنی عقل نہیں بلکہ جذبات سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اس نے کسی برتر ہستی کو مان لیا تو اس کے نتیجے میں اسے کچھ اخلاقیات کا پابند ہونا پڑے گا جبکہ وہ ایسا ہونا نہیں چاہتا۔

خود کو اخلاقی پابندیوں سے آزاد کروانے کی خواہش انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی اور وہ شتر بے مہار بن کر اپنی خواہشات کا غلام بنتا چلا جاتا ہے جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ زمین ظلم اور فساد سے بھر جاتی ہے۔

ایک عقل مند انسان ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنا سر اپنے رب کے حضور جھکا دیتا ہے اور اس کی اطاعت میں سر گرداں ہو جاتا ہے۔ خود پر لگائی ہوئی ان اخلاقی پابندیوں کے باعث اس کی آزادی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس کے نتیجے میں وہ رب کائنات کی بنائی ہوئی اس عظیم کائنات سے ہم آہنگ (Harmonize) ہو جاتا ہے جو پکار پکار کر اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہوئے زبان حال سے یہ کہہ رہی ہے کہ تبارک اللہ احسن الخالقین۔

ایک طرف تو معاملہ یہ ہے کہ انسان کائنات میں غور و فکر کرتا ہوا اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ دوسری طرف اسی غور و فکر سے خود بخود یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ وہ خالق صرف اور صرف ایک ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں ایک عظیم ہم آہنگی (Harmony) پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال ہم اوپر لاء آف کمپیر یٹو ایڈوانٹج اور کشتی کے تیرنے کے قانون میں ہم آہنگی سے دیکھ چکے ہیں۔ اسی طرح اجرام فلکی کی رفتار اور ان کے مابین کشش کی قوت کی ہم آہنگی بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ سیاروں کی گردشی حرکت اور ایک چھوٹے سے ایٹم میں موجود الیکٹران کی حرکت میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح مختلف جانوروں کے نظام جسم میں بھی اتنی یکسانیت پائی جاتی ہے کہ انسانی عقل یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ ان سب کا خالق ایک ہی ہے۔

یہ بات اتنی منطقی ہے کہ دور قدیم میں جب شرک کا غلبہ ہوا تب بھی انسانوں کی عظیم اکثریت دو یا دو سے زائد ایک جتنے طاقتور خداؤں کے وجود کی قائل نہ ہو سکی۔ ان کے ہاں دیوتاؤں کی ایک تنظیم (Hierarchy) کے تصور نے جنم لیا۔ اس تنظیم میں چھوٹے دیوتا بڑے دیوتاؤں کے ماتحت مانے گئے اور ان سب کے اوپر ایک عظیم خدا کی حکمرانی کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس طرح کم و بیش تمام نسل انسانی ایک سپریم خدا کے وجود کی ہمیشہ سے قائل رہی ہے۔ اللہ تعالی کی جو ہدایت انبیاء کرام اور الہامی کتب کے ذریعے انسان کو دی گئی اس میں یہ صاف صاف بتا دیا گیا کہ دیوتاؤں کی اس تنظیم کا تصور بالکل غلط ہے۔ خدا صرف اور صرف ایک ہی ہے، وہی سپریم ہے اور کوئی مخلوق اس کے خدا

ہونے میں کسی درجے میں بھی شریک نہیں ہے۔

خدا سے محبت

وَمِنْ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَاداً يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبّاً لِلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعاً وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ۔ (البقرة165 :2)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مد مقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے۔ (دوسری طرف) اہل ایمان اللہ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔ کاش جو کچھ عذاب کو دیکھ کر انہیں سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان ظالموں کو سوجھ جائے کہ ساری قوتیں اللہ ہی کے قبضے میں ہیں اور اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔

جو لوگ شرکیہ نظریات یا افعال کے اسیر ہو جاتے ہیں، ان کی نظر میں ان دیوتاؤں یا بزرگوں کی حیثیت اللہ تعالی کی حیثیت سے بھی بڑھ جاتی ہے جنہیں وہ لاشعوری یا شعوری طور پر خدا کا مقام دے چکے ہوتے ہیں۔ ان کی تمام تر عقیدت اور محبت کا مرکز اپنا دیوتا یا شخصیت بن جاتی ہے اور اللہ تعالی کا ذکر کم ہی ان کی زبان پر آتا ہے۔

اس رویے کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور دنیا کا ہر

کام کرتے ہوئے ان کی زبان سے اللہ کے نام کی بجائے اس شخصیت کا ذکر جاری رہتا ہے اور خود کو حاصل ہونے والی تمام نعمتوں کو اللہ کی عطا قرار دینے کی بجائے اس شخصیت کا کرم قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد تو ان کی زبان سے شاید ہی کبھی نکلے لیکن اس شخصیت کی مدح سرائی ان کی زبان سے ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اگرچہ یہ لوگ شعوری طور پر اس شخصیت کو خدا قرار نہ بھی دیں لیکن ان کا سلوک اس سے وہی ہوتا ہے جس کا حقدار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

قرآن مجید اپنے ماننے والوں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ ان کا رویہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی تمام تر عقیدت اور محبت کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہونی چاہیے۔ کائنات کی ساری قوتیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں۔ آخرت میں انسان کو اسی کے سامنے پیش ہونا ہے۔ انسان کو یہ چاہیے کہ وہ صرف اور صرف اپنے رب کا بندہ ہی بن کر رہے اور اسی کو اپنی محبتوں کا مرکز بنائے۔ ہر وقت اسی کے نام کی مالا جپے اور اسی کا بندہ بن کر رہے۔

بعض نادان لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے مقابلے پر لے آتے ہیں اور معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا بالعموم لاشعوری طور پر ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ایمان کا تقاضا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق اس محبت کے بغیر ایمان بھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ قرآن مجید اور احادیث کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ محبت اسی بنیاد پر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ ہی کے رسول ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے

اللہ تعالی نے ہمیں ایمان کی دولت سے مالا مال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہٖ و سلم کے ذریعے ہی اللہ تعالی نے ہم تک اپنا پیغام ہدایت پہنچایا۔ اسی وجہ سے ہم آپ کی ذات والا صفات سے محبت کرتے ہیں۔

غور کیا جائے تو یہ محبت اللہ تعالی کی محبت ہی کا ایک جزو ہے۔ محبت رسول، محبت خدا کے مد مقابل کوئی چیز نہیں بلکہ یہ اللہ تعالی سے کی جانے والی محبت ہی کا ایک حصہ ہے۔ اللہ تعالی اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے والا ایک سچا مومن کبھی بھی خدا اور رسول کی محبت کو الگ الگ کر کے انہیں ایک دوسرے کے مد مقابل نہیں لاتا بلکہ محبت رسول کو محبت خدا کا حصہ بنا کر اللہ تعالی سے محبت میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک موقع پر بعض افراد نے حضور صلی اللہ علیہ و سلم کی مدح سرائی میں ایسے اشعار پڑھے جن میں آپ صلی اللہ علیہ و سلم سے بعض ایسے معاملات منسوب کر دیے گئے تھے جو صرف اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم اس پر بہت ناراض ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے اس سے سختی سے منع فرمایا کہ مجھے اللہ کا شریک بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔

مذہبی ہستیوں کے علاوہ بسا اوقات انسان اپنی طرح کے کسی دوسرے انسان کی محبت میں بھی اس طرح مبتلاء ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے ہر لمحہ ہر موقع پر اسی کو ترجیح دیتا ہے۔ اولاد کی محبت، بیوی کی محبت، دوستوں کی محبت یقیناً حق اور جائز ہے لیکن یہ کسی بھی صورت خدا کے حکم سے زیادہ نہیں ہے۔ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اہل و عیال کی محبت میں ان کی مادی خوش حالی کے لیے

حرام مال کمائے۔

رہنمائے دین کا انتخاب

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنْ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمْ الأَسْبَابُ۔ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَلِكَ يُرِيهِمْ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْ النَّارِ۔ (البقرة 2: 166-167)

جب وہ عذاب دے گا تو (کیفیت یہ ہو گی کہ) وہی پیشوا اور راہنما، جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی، اپنے پیروکاروں سے بیزار ہو جائیں گے اور ان کے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اس وقت ان کے پیروکار کہیں گے، "کاش! ہمیں ایک بار موقع دیا جائے تو جس طرح یہ آج ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیں۔" اس طرح اللہ ان کے وہ اعمال جو اس دنیا میں یہ لوگ کر رہے ہیں، ان کے سامنے اس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں کے ساتھ ہاتھ ملتے رہیں گے مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ انہیں نہ مل سکے گی۔

اس دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو اپنی ذہانت، علم یا کسی اور وجہ سے قیادت کے منصب پر فائز ہیں اور دوسرے وہ جو ان کے پیروکار ہیں۔ اس دنیا میں اگرچہ اچھے قائدین بھی پائے جاتے ہیں لیکن ان میں کچھ اگر گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ یا تو

دین کے معاملے میں مخلص نہیں ہوتے یا پھر مخلص ہونے کے باوجود اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔ عام لوگوں کی گمراہی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ اپنے گمراہ قائدین کے اندھے پیروکار بن کر زندگی بسر کرنے کا وطیرہ اختیار کرتے ہیں۔

ایک عام آدمی کے لئے یہ بڑا مشکل ہے کہ وہ اس بات کا تعین کر سکے کہ اس کے قائد کی نیت کیا ہے اور وہ کس حد تک اسے گمراہ کر سکتا ہے؟ اس مسئلے کا حل وہی ہے جو ہم سب دنیاوی معاملات میں اختیار کرتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی کو تھوڑی سی رقم ادھار دینا ہو یا اس سے کوئی کاروباری معاملہ کرنا ہو تو اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پوری طرح تفتیش کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ سامنے والا کیسا انسان ہے؟ اس کا ماضی کیا ہے؟ دوسرے لوگوں کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ ہم اس شخص کے کردار، شخصیت، افکار اور اعمال کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں، اس کا دوسروں سے تقابل کرتے ہیں اور پوری طرح اطمینان ہونے کے بعد اس سے لین دین کا کوئی معاملہ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ اطمینان ہو جانے کے بعد بھی احتساب کا یہ عمل پوری طرح چلتا رہتا ہے اور کوئی منفی پہلو سامنے آنے پر پہلی رائے میں تبدیلی بھی کی جاتی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیاوی اعتبار سے نہایت زیرک اور معاملہ فہم قسم کے لوگ بھی دینی معاملات میں اس کے بالکل برعکس رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جب وہ دین کی طرف مائل ہوتے ہیں تو بلاسوچے سمجھے اچھی تقریر و تحریر کا حامل جو راہنما سب سے پہلے مل جاتا ہے اسے اپنا قائد مان کر اس کی اندھادھند پیروی شروع کر دیتے ہیں۔

اگر ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک دور کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ اندھی پیروی کا ان کے ہاں کوئی رواج نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ نے گناہوں اور خطاؤں سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ مشورے اور مثبت تنقید کو فروغ دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آ جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی پیروی کرتے ورنہ عام لوگوں سے مشورہ کرتے جس میں یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختلاف رائے بھی کر لیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ صرف اس اختلاف رائے کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے بلکہ اپنی رائے کے خلاف اکثریتی رائے کے مطابق فیصلہ بھی فرما لیا کرتے تھے۔ جنگ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کے مشورے پر اپنی حکمت عملی تبدیل فرمائی۔ جنگ احد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ شہر میں رہ کر دفاعی جنگ کرنے کا تھا لیکن نوجوان صحابہ کرام کی اکثریت کی رائے کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر سے نکل کر جنگ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ جنگ خندق میں سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول کر کے خندق کھودنے کا فیصلہ فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مثبت تنقید کا ماحول برقرار رہا۔ قائدین کے کڑے احتساب کو خود خلفاء راشدین نے فروغ دیا۔ لوگ سر عام خلیفہ پر تنقید کیا کرتے اور خلیفہ اس کا جواب دینے کا پابند ہوا کرتا۔ سیدنا ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے منصب خلافت سنبھالنے کے فوراً بعد کے خطبات اگر پڑھے جائیں تو اندازہ ہو گا کہ یہ

حضرات مثبت تنقید اور احتساب کو کتنی اہمیت دیا کرتے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ایسے واقعات بہت مشہور ہیں جن میں لوگوں نے آپ کے فیصلوں پر تنقید کی اور آپ نے اپنے فیصلے کو تبدیل بھی کر لیا۔

دینی مسائل جاننے کے لئے صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کا طریق کار یہ تھا کہ وہ فقہا صحابہ کی طرف رجوع کیا کرتے اور اگر ایک صحابی کی رائے سے انہیں اطمینان نہ ہوتا تو دوسرے سے پوچھ لیتے۔ بخاری و مسلم میں ایسے واقعات کثرت سے موجود ہیں جن میں لوگوں نے ایک مسئلے پر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے جاننے کے بعد سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کیا اور آپ نے ان کی رائے پر کڑی تنقید کی۔ اس سب کے باوجود ان کے ہاں ایک دوسرے کے احترام اور محبت میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔

بعد کے ادوار میں ہمارے ہاں قائدین اور مذہبی راہنماؤں کے ساتھ اندھی عقیدت کا رواج جاری کر دیا گیا۔ مذہبی راہنما کو ان کے منصب سے بڑھا کر رسول سے بھی کچھ زیادہ حیثیت دے دی گئی۔ ایک مخصوص عالم یا شیخ کے ساتھ وابستہ ہونے کی تلقین کی جانے لگی اور اس کے حکم کی ادنی درجے میں خلاف ورزی کئے جانے پر جہنم کی وعید سنائی جانے لگی۔ ایسا ماحول تخلیق کیا گیا جس میں 'صرف سنو اور مانو' کا رویہ اختیار کرنے کو شخصیت کا حصہ بنایا گیا۔ مثبت تنقید بھی ایک برائی قرار پائی اور عقل کو دوسرے درجے کی چیز قرار دے کر اس کے استعمال پر پابندی عائد کی گئی۔ شخصیت پرستی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لئے مہم چلائی جاتی ہے اور جو شخص جتنا زیادہ شخصیت پرست

ہو، اسے اپنے حلقے یا جماعت میں اتنا ہی بڑا منصب عطا کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کی ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ گمراہ لیڈروں کی پیروی کے باعث جب ان کے پیروکاروں کو لیڈروں کے ساتھ سزا دی جائے گی تو وہ اپنے پیروکاروں سے بیزار ہو جائیں گے۔ اس وقت اندھی پیروی کرنے والوں کو سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہ ہو گا اور وہ یہ خواہش کریں گے کہ کاش! ہمیں دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تو ہم ان سے بیزار ہو کر دکھا دیں۔ ان کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکے گی کیونکہ زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے۔

لیڈر خواہ مذہبی عالم ہو، سیاسی راہنما ہو یا صوفی شیخ ہو، کیا وہ آپ سے مخلص ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنا آج ہی ضروری ہے تاکہ قیامت کے دن ہم اس حسرت سے بچ سکیں جو ان آیات میں بیان ہوئی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ موجودہ دور میں مخلص مذہبی راہنما ڈھونڈنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ راہنماؤں کی اکثریت بہروپیوں پر مشتمل ہے جو کہ اپنے پیروکاروں کو گمراہ کر کے دنیاوی فوائد سمیٹنے کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ اگر کوئی مخلص ہے تو وہ بھی مخصوص مذہبی مفادات اور تصورات کے تحت لاشعوری طور پر اپنے پیروکاروں کا استحصال کرتا نظر آتا ہے۔ اپنی ذاتی تجربات کی بنیاد پر چند تجاویز آپ کی خدمت میں پیش ہیں جن پر عمل کر کے آپ یہ تعین کر سکتے ہیں کہ آپ کا راہنما کس درجے میں آپ کا استحصال کر رہا ہے:

- سب سے پہلے تو یہ طے کر لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہو چکی اور اب کوئی کامل نہیں ہو سکتا۔ اب سب کی عقل اور علم ناقص ہے۔ ہمارا راہنما بھی

ہماری طرح کا انسان ہی ہے جس سے غلطی ہو سکتی ہے۔

- اپنے راہنما پر خلوص نیت سے مثبت انداز میں تنقید کر کے دیکھیے۔ اگر وہ اس پر برہم ہو جائے اور آپ کو مطمئن کرنے کی بجائے الٹا آپ پر تنقید شروع کر دے تو یہ جان لیجیے کہ وہ آپ سے مخلص نہیں۔
- لیڈر کے قریبی لوگوں سے ملیے اور یہ دیکھیے کہ ان کے درمیان لیڈر کے احتساب کا ماحول کس حد تک قائم ہے۔ اگر یہ لوگ مثبت تنقید اور سوال کرنے کو برا سمجھیں اور لیڈر کو ہر عیب سے پاک تصور کریں تو یہ جان لیجیے کہ لیڈر آپ سے مخلص نہیں۔
- اس بات پر غور کیجیے کہ لیڈر کے معاشی وسائل کیا ہیں۔ اگر اس کی گزر بسر اپنے پیروکاروں کی مالی امداد پر ہے تو یہ دیکھیے کہ اس کا لائف اسٹائل کس حد تک اس کے پیروکاروں کے قریب ہے۔ اگر وہ اپنے پیروکاروں کی نسبت عالیشان گھر میں رہتا ہے، اعلیٰ درجے کی گاڑی میں سفر کرتا ہے اور پر تعیش زندگی بسر کرتا ہے تو وہ ان سے مخلص نہیں ہو سکتا۔ قحط کے زمانے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے گھی اور گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا کیونکہ وہ اپنا لائف اسٹائل عوام سے بلند نہ رکھنا چاہتے تھے۔
- غور سے دیکھیے کہ مختلف لوگوں کے ساتھ لیڈر کے رویے میں کتنا فرق ہے۔ کیا وہ امیر لوگوں پر مہربان اور غرباء کو دھتکارنے والا ہے؟ کیا وہ کسی کے ساتھ غیر معمولی عاجزی کے ساتھ پیش آتا ہے اور کسی کے ساتھ درشتگی اور حقارت سے؟ کہیں اس تک پہنچنے کے راستے چند لوگوں کے لئے تو کھلے ہیں لیکن دوسروں کے لئے بند؟ اگر ایسا ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس لیڈر کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔

- اس بات کو نوٹ کیجیے کہ لیڈر کے قریبی لوگوں کی جانب سے اس کی شخصیت کو اعلی و ارفع ظاہر کرنے کی باقاعدہ کوشش تو نہیں کی جارہی؟ایسا بالعموم دینی جماعتوں اور علماء و صوفیا کے حلقوں میں کیا جاتا ہے۔ اگر ایسی کوئی کوشش کی جارہی ہے اور لیڈر کی عظمت کو دلوں میں اتارا جارہا ہے تو پھر لازماً دال میں کچھ کالا ہے۔
- لیڈر پر باہر کے حلقوں سے کی جانے والی تنقیدات کا مطالعہ کیجیے۔ ان لوگوں سے ملیے جو لیڈر کو کسی وجہ سے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ان سے علیحدگی کی وجہ دریافت کیجیے۔ اس تفتیش کے نتیجے میں جو معلومات حاصل ہوں، اپنے لیڈر سے اس کا جواب طلب کیجیے۔ لیڈر کے دیے ہوئے دلائل کا موازنہ ناقدین کی تنقید سے کیجیے اور بغیر کسی تعصب کے دیکھیے کہ کس کی بات میں وزن زیادہ ہے۔
- اگر ان تمام تجاویز پر عمل کرنے کے نتیجے میں یہ معلوم ہو کہ آپ کا راہنما آپ سے مخلص ہے تو اس راہنما سے اپنا تعلق مضبوط کیجیے لیکن مثبت تنقید کا عمل ساری عمر جاری رکھیے۔ لیڈر کے قول و فعل کو اللہ تعالی کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر پیش کرتے رہیے۔ جہاں آپ کو خامی نظر آئے، اپنے راہنما سے وضاحت طلب کیجیے۔ اگر وہ خامی واقعتاً موجود ہو گی اور راہنما بھی مخلص ہو گا تو وہ اپنی اصلاح کر لے گا اور آپ کو اس اصلاح کا اجر ملے گا۔ اگر وہ خامی موجود نہیں ہو گی تو اس کی وضاحت آپ کو مطمئن کر دے گی۔ یہ عمل زندگی بھر کبھی ختم نہیں ہونا چاہیے۔

آباء واجداد کی اندھی پیروی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لا يَعْقِلُونَ شَيْئاً وَلا يَهْتَدُونَ ۔ (البقرة 2: 170)

ان سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں، ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا یہ لوگ پھر بھی انہی کی پیروی کرتے چلے جائیں گے؟

آباء واجداد اور مذہبی راہنماؤں کی اندھی تقلید کا یہ رویہ ہمارے معاشرے میں بھی عام ہے۔ جب تک کوئی شخص زندہ رہتا ہے، ہمارے ہاں اسے بالعموم پذیرائی نصیب نہیں ہوتی۔ مرنے کے بعد وہ شخص قوم کا اثاثہ بن جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے تقدس کی حیثیت حاصل ہو جایا کرتی ہے۔ بسا اوقات یہ حیثیت اتنی بڑھتی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے مقابلے میں آباء واجداد کو ترجیح دی جاتی ہے اور ان کے بنائے ہوئے رسم ورواج کو خدا کے احکامات پر فوقیت دی جانے لگتی ہے۔

دور کیوں جایئے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ بیٹیوں کو وراثت میں حصہ دیا جائے لیکن ہماری جاگیردارانہ

معاشرت میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالی کا حکم ہے کہ تعصبات سے بالاتر ہو کر دین کو خالصتاً اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جائے لیکن ہمارے ہاں مذہبی فرقے اور ان سے پیدا ہونے والے تعصبات زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس بات کا تصور بھی محال ہے کہ کوئی اپنے باپ دادا کے مسلک سے ہٹ کر محض اس بات پر دوسرا نقطہ نظر اختیار کرے کہ اسے وہ حق کے زیادہ قریب لگتا ہے۔

قرآن مجید اس معاملے میں بالکل ہی مختلف نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک انسان کو اس بات سے دلچسپی نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے باپ دادا کا مذہب یا مسلک کیا ہے؟ انسان کی دلچسپی اس بات سے ہونی چاہیے کہ حق بات کیا ہے خواہ وہ کوئی بھی کہہ رہا ہو۔ ذرا غور کیا جائے تو یہی نقطہ نظر عقل و دانش کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔

ہم اگر اپنے دنیاوی معاملات کا جائزہ لیں تو وہاں ہم ٹھیک اسی اصول پر عمل درآمد کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم کبھی اس وجہ سے تجارت، زراعت اور صنعت میں قدیم طریقوں کی پیروی نہیں کرتے کہ صدیوں سے ہمارے باپ دادا یہی کرتے آ رہے ہیں۔ جیسے ہی کوئی نئی مشین ایجاد ہوتی ہے، ہم اس کے ذریعے کام کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ اس کے بہتر نتائج سامنے آ رہے ہوتے ہیں۔ ہم کسی نئی نفع بخش پراڈکٹ میں تجارت اس وجہ سے ترک نہیں کر دیتے کہ اس میں ہمارا دشمن ڈیل کرتا ہے۔ ہماری دلچسپی اسی بات میں ہوتی ہے کہ جس طریقے سے بھی ہم زیادہ سے زیادہ نفع کما سکتے ہیں، اسی کو اختیار کرتے ہیں۔

دین کے معاملے میں ہمیں یہی کرنا چاہیے۔ دین پر عمل کرنے کا مقصد ہماری نجات ہے جو صرف حق بات کو ماننے اور درست طریقے پر عمل کرنے سے ممکن ہے۔ ہم حق تک صرف اور صرف اسی صورت میں پہنچ سکتے ہیں جب ہم خالی الذہن ہو کر خالصتاً غیر متعصبانہ طریقے سے حق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب بھی انسان ایسی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ حق کی طرف اس کی راہنمائی کرتا ہے۔

حلال وطیب کھانے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ. إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنْ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلا عَادٍ فَلا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ (البقرة2: 172-173)

اے اہل ایمان! اگر تم حقیقتاً اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو ہم نے تمہیں جو پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں انہیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ تعالی کی طرف سے تم پر اگر کوئی پابندی ہے تو وہ یہ ہے کہ مردار نہ کھاؤ، خون اور سور کے گوشت سے پرھیز کرو، اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے اور وہ قانون شکنی کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور نہ ہی سرکش ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

کھانے پینے کے معاملات ایسے ہیں جن میں انسان افراط و تفریط کا شکار ہوا ہے۔ بعض لوگوں نے ایسی چیزوں کو بھی کھانا شروع کر دیا جن کے تصور سے ہی ایک سلیم الفطرت شخص کو گھن آتی ہے۔ دوسری انتہا پر بعض لوگوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان کو کھانے سے ہی پرہیز کرنا چاہیے اور کم

سے کم پر گزارا کرنا چاہیے۔ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے بعض حلال چیزوں کے کھانے کو جانداروں پہ ظلم قرار دے دیا۔

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ یہ دونوں انتہا پسندانہ نقطہ ہائے نظر بحیثیت مجموعی نسل انسانی کے بہت چھوٹے چھوٹے سے گروہوں نے اختیار کیے۔ آج بھی کتے بلے اور سانپ کھانے والوں یا پھر سرے سے ہی گوشت سے پرہیز کرنے والوں کا تناسب نسل انسانی میں بہت کم ہے۔ جنوب مشرقی ایشیائی اقوام کی اکثریت بھی عام طور پر اپنی غذا میں انہی چیزوں کو استعمال کرتی ہے جنہیں پوری دنیا کے انسان حلال وطیب سمجھ کر کھاتے ہیں۔

اللہ تعالی نے انسان کو فطری طور پر یہ سکھا دیا ہے کہ کیا چیز کھانے کے لئے حلال وطیب ہے اور کیا چیز اپنے اندر کراہت رکھتی ہے۔ جس طرح ایک بکری کا بچہ پیدا ہوتے ہی جانتا ہے کہ سبز چارہ اس کے کھانے کی چیز ہے اور گوشت نہ کھانے کی، اسی طرح انسان کے بچے کی فطرت کو اگر مسخ نہ کیا جائے تو وہ جانتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے۔

قرآن مجید نے دونوں طرز کی انتہا پسندی سے بچتے ہوئے اپنے ماننے والوں کو اجازت دی ہے کہ وہ بلا تکلف حلال وطیب چیزیں کھا سکتے ہیں۔ چونکہ انسان اپنی فطرت میں یہ جانتا ہے کہ حلال وطیب کیا چیزیں ہیں اس لئے ان کی ایک جامع و مانع فہرست پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ سوالات پوچھنے پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرما دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں، گندگی کھانے والے بدبودار جانور اور پالتو گدھے کا

گوشت کھانے سے منع فرمایا۔

چند چیزوں کے معاملے میں انسانوں کو بالعموم یہ فیصلہ کرنے میں غلطی پیش آئی ہے کہ وہ پاک ہیں یا ناپاک۔ ان میں مردار، خون اور خنزیر شامل ہیں۔ قرآن مجید نے اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ یہ چیزیں ناپاک اور کھانے کے لائق نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس کھانے میں جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام نذر کیا گیا ہو، ان میں شرک کی غلاظت شامل ہو جاتی ہے، اس لئے اس سے بھی اہل ایمان کو منع فرمایا گیا ہے۔

قرآن مجید نے یہاں یہ اصول بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کر دیا کہ دین کے احکامات نارمل حالات کے لئے ہیں۔ غیر معمولی مشکلات کی صورت میں انسان مجبوراً اگر ان احکام کی خلاف ورزی کر بیٹھے اور دل سے اپنے رب سے ڈرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا۔

نیکی کیا ہے؟

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُوْلَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (البقرة 2: 177)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق یا مغرب کی طرف کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ، آخرت کے دن، فرشتوں، کتاب، اور نبیوں کو مانے، اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں، اور غلاموں کو آزاد کروانے کے لئے خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکوۃ دے۔ نیک تو وہ لوگ ہیں جو جب وعدہ کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں اور تنگی و مصیبت میں اور جنگ کے موقع پر صبر کرتے ہیں۔ یہی یہ راستباز لوگ اور یہی متقی ہیں۔

اہل کتاب کے ہاں قبلے کا فرق ایک معرکۃ الآرا بحث تھی۔ ایک گروہ بیت المقدس کے مشرقی حصے کو قبلہ مانتا اور دوسرا مغربی حصے کو۔ اللہ تعالی نے یہ بیان کر دیا کہ اس قسم کی بحثیں اللہ کے نزدیک لا

یعنی ہیں۔ یہ بات ایک مثال کے طور پر بیان ہوئی۔اس قسم کی جتنی بھی بحثیں ہمارے مذہبی حلقوں میں پائی جاتی ہیں ان سب کی یہی حیثیت ہے۔

اصل نیکی یہ لایعنی بحثیں، فقہی و کلامی اختلافات اور کسی مخصوص گروہ سے وابستگی نہیں بلکہ ایمان و اخلاقیات ہیں۔ قرآن مجید نے ایمان کا جو تصور پیش کیا ہے، اس کے مطابق اللہ تعالی، آخرت، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔اسی ایمان کی وضاحت احادیث میں کی گئی ہے۔

ایمان کے بعد اہم ترین چیز اخلاقیات ہیں۔ ضرورت مندوں پر اللہ تعالی کی رضا کے لئے خرچ کرنا عظیم نیکی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں غلامی کی لعنت دنیا میں موجود تھی، اسے تدریجاً ختم کرنے کے لئے غلاموں کو آزاد کرنے پر زور دیا گیا۔ نماز کا قیام اہم ترین نیکی ہے اور انسان کے اعلی اخلاق کا حصہ ہے کیونکہ یہ رب کریم کا شکر ہے جو بندے کو اس کی نعمتوں کے جواب میں ادا کرنا چاہیے۔

وعدے کو پورا کرنا اور مصیبت میں ثابت قدمی اختیار کرنا نیکی کا اہم ترین پہلو ہے۔ نیکی کے یہ وہ پہلو ہیں جو ہمارے معاشرے میں بالعموم ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم لوگ عام طور پر وعدہ کر کے وقت پر نہیں پہنچتے۔ کاروباری معاملات میں وعدہ خلافی اور وقت پر دوسرے کا حق نہ دینا عام ہے۔ مصیبت کے موقع پر ہم لوگ چیخ و پکار اور توڑ پھوڑ میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالی کے حکم کے خلاف بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ آیت اسلام میں نیکی کے جامع تصور کو بالکل کھول کر بیان کر دیتی ہے جس میں سوشل ورکنگ ایک بنیادی شے ہے۔ آیت مبارکہ میں تلقین کے ساتھ ایمان باللہ اور آخرت کے تصور سے اس میں اخلاص بھی پیدا کر دیا کہ جو بھی کام ہو صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو نہ کہ دنیاوی دکھلاوے کے لیے۔ خدا کی مخلوق کی بلا امتیاز بقدر طاقت و استطاعت خدمت کرنا اور انہیں نفع پہنچانا اسلامی اخلاق کا ایک اہم ترین منشا ہے۔ اس آیت میں صرف عبادات کو نیکی سمجھ لینے کے خیال کی واضح طور پر تردید بھی کی گئی ہے اور صرف سماجی خدمات کو نیکی سمجھنے کی بھی۔

اس آیت کی روشنی میں اپنی شخصیت کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم لوگ ان نیکیوں پر کس حد تک قائم ہیں۔ آیئے اس آیت میں دی گئی نیکیوں کی فہرست کا جائزہ لیں اور اپنی شخصیت کا محاسبہ کریں:

- اللہ تعالیٰ پر ایمان
- آخرت پر ایمان
- فرشتوں، آسمانی کتابوں اور رسولوں پر ایمان
- اللہ کی راہ میں حاجت مندوں پر خرچ کرنا
- نماز قائم کرنا
- زکوۃ دینا
- وعدہ پورا کرنا
- مصیبت میں ثابت قدم رہنا اور صبر کرنا
- سماج کی خدمت

قتل کا قصاص کیوں ضروری ہے؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمْ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالأُنثَى بِالأُنثَى فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنْ اعْتَدَى بَعْدَ ذَلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُوْلِي الأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ (البقرة 2: 178-179)

اے اہل ایمان! تمہارے لئے قتل کے مقدموں میں قصاص کو قانون بنایا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے۔ غلام قاتل ہو تو وہی غلام قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اسی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا (دینی) بھائی نرمی کے لئے تیار ہو تو رواج عام کے مطابق دیت کا تصفیہ کیا جائے اور قاتل پر لازم ہے کو وہ احسن طریقے سے ادائیگی کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر جو بھی زیادتی کرے، اس کے لئے دردناک سزا ہے۔ اے اہل عقل! تمہارے لئے قصاص کے اس قانون میں زندگی ہے تاکہ تم (اللہ کے قانون کی خلاف ورزی سے) بچنے والے بنو۔

اللہ تعالیٰ کے قانون میں انسانی جان کو بے پناہ حرمت دی گئی ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری عام خطبے میں جو تعلیمات ارشاد فرمائیں اس میں انسانی جان، مال اور آبرو کی حرمت کو بیت اللہ کی حرمت کے برابر قرار دیا۔

قتل دو طرح کا ہوا کرتا ہے: ایک تو قتل عمد جس میں قاتل پورے ارادے اور منصوبے سے قتل کرتا ہے اور دوسرا قتل خطا جس میں غلطی سے بغیر ارادے کے کوئی شخص ہلاک ہو جائے۔ پہلی صورت کا قانون یہ بیان کیا گیا کہ ایسا کرنے والے قاتل کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو اس نے مقتول کے ساتھ کیا۔ انسانوں کی غالب اکثریت نے اس معاملے میں اسی قانون پر عمل کیا۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جس معاشرے میں اس قانون پر عمل کیا گیا، وہاں انسانی جان کی حرمت برقرار رہی۔ جس معاشرے نے بھی اس قانون سے منہ موڑا، اس کے نتیجے میں اس معاشرے میں انسانی خون پانی سے بھی سستا ہوا جس کے نتیجے میں پورا معاشرہ انتشار کا شکار ہو گیا۔

اللہ تعالی کی شریعت میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ قتل کی سزا صرف اور صرف قاتل کو ہی دی جائے۔ ہماری دیہاتی اور قبائلی معاشرت قتل کی سزا بالعموم قاتل کے ساتھ ساتھ اس کے قریبی رشتے داروں بالخصوص اس کی بیوی، بہن اور بیٹی کو بھی دی جاتی ہے۔ ایسا کرنے والا اپنی حد سے تجاوز کرنے والا ہے جس کے لئے اللہ تعالی کے ہاں دردناک عذاب منتظر ہے۔

اگر مقتول کا وارث، قاتل کو معاف کر دینے پر راضی ہو تو اسے معاشرے کے قانون کے مطابق دیت کی رقم ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالی نے اس حکم کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے ان سے واضح ہے کہ ایسا کرنا اللہ تعالی کو پسند ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں معاشرے میں نفرت اور انتقام در انتقام

کی فضا کی بجائے محبت والفت کی فضا پیدا کی جاسکتی ہے۔

اس بات کا بھی خیال رہنا چاہیے کہ قصاص کی اس سزا کا نفاذ صرف اور صرف معاشرے کے نظم اجتماعی یعنی حکومت کا فرض ہے۔ اگر کوئی حکومت اس معاملے میں دین کے حکم پر عمل نہیں کرتی اور ناانصافی سے کام لیتی ہے تو قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی بجائے مقتول کے ورثا کو یہ معاملہ اللہ تعالی پر چھوڑ دینا چاہیے جو کبھی ناانصافی نہ کرے گا اور ہر مجرم کو اس کی پوری سزا دے گا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے معاملات میں جو جذباتی فضا بنا کر مقتول کے ورثا کو خود انتقام لینے پر مجبور کیا جاتا ہے وہ اللہ تعالی کے احکام کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایسے مواقع پر بہترین طرز عمل اپنے معاملے کو اللہ تعالی کے سپرد کر دینا ہے اور صبر کرنا ہے جس کی جزا انسان کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں مل کر رہے گی۔

اللہ آپ کے قریب ہے

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِي إِذَا دَعَانِي فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ۔ (البقرة179-178 :2)

اور جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں (تو انھیں بتائیں کہ) میں ان سے قریب ہوں، میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے۔ لہٰذا انھیں چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہِ راست پر آئیں۔

بتوں کی پرستش کرنے والے عرب اپنے عمل میں جواز میں کہا کرتے تھے کہ مانعبدھم الا لیقربنا الی اللہ زلفی۔ ہم انھیں مطلقاً نہیں پوجتے بلکہ اس لیے کہ (اس تعظیم و سجود سے) یہ خوش ہو کر خدا کے پاس ہماری سفارش کرتے ہیں۔ آج بھی شرک میں مبتلاء افراد کم و بیش اسی قسم کے دلائل دیتے ہیں۔ مگر یہ رویہ عقل کی رُو سے کسی بھی طرح صحیح نہیں کہ بادشاہ آپ کے گھر پہ ہو مگر آپ سفارش کے لیے کسی وزیر کی تلاش کریں۔ اس آیت کو ایک بار پھر پڑھیے، اللہ رب العزت کتنی محبت سے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں اپنے بندے سے بے حد قریب ہوں۔ مجھے پکارنے کے لیے تمھیں کو مصلےٰ بچھانے کی بھی ضرورت نہیں، کسی بھی لمحے مجھے پکارا جا سکتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ

میرا بندہ جب بھی مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا ہوں اور ہر مشکل میں اسے تھام لیتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ مجھ پر ہی یقین رکھے، میرے ہی آگے اپنا سر جھکائے، میری ہی پرستش کرے، مجھ ہی سے مدد چاہے، مجھ ہی کو اپنا داتا اور اپنا مالک مانے۔

کتاب غرر الحکم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایک قول منسوب ہے کہ "بندوں کے پاکیزہ دل ہی نگاہِ پروردگار کا مقام ہوتے ہیں۔" یہ حقیقت ہے کہ خدا کے قرب اور بعد کا انحصار حالتِ قلب پر ہی ہے۔ خدا اسی کے قریب ہے جو اپنے قلب کی حالت بھی اس قدر پاکیزہ رکھے کہ خدا کا قرب حاصل ہو۔ اگر دل میں نفسانی آلائشوں کا ڈھیر لگا ہو، ریاء اور نمود و نمائش کا سیاہ کیچڑ بھی اسی دل میں جما ہوا ہے، احساسِ جواب دہی اور یادِ الٰہی سے دل غافل ہو تو پھر ہر شے آپ سے قریب ہے سوائے اللہ کی پاک ذات کے۔

رشوت اور حرام مال

وَلاَ تَأْكُلُواْ أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُواْ بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُواْ فَرِيقاً مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ

(البقرة-188 :2)

اور آپس میں تم ایک دوسرے کے مال ناحق نہ کھایا کرو اور حاکموں کے آگے (بطورِ رشوت) پیش کرو کہ اس طرح تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طریقے سے کھا سکو حالانکہ تمہارے علم میں ہو (کہ یہ گناہ ہے)

قرآن مجید کی بے شمار آیاتِ مبارکہ شاہد ہیں کہ یہود کی مذمت اسی وجہ سے کی گئی ہے کہ یہود قانون کی زد سے بچنے کے لیے مال ار اور اہل ثروت طبقہ علانیہ رشوت دیتے اور ان کے قاضی یہ رشوت لے کر ان کے حق میں فیصلہ سنادیتے تھے، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ ان کے مذہبی پیشوا تورات کے احکام پر پردہ ڈالتے تھے۔ یہ مرض یہود کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی جس کا ظہور عہد نبوت میں بھی کئی بار ہوا۔

دور، نبوی میں خیبر کے یہودیوں سے زمین کی نصف پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی، جب پیداوار کی

تقسیم کا وقت آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجتے۔ عبداللہ بن رواحہ انتہائی دیانت داری کے ساتھ پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو۔ ایک بار یہودیوں نے آپس میں اپنی عورتوں کے کچھ زیورات اکٹھے کیے اور ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس مال کے بدلہ تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو، یہ سن کر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو، لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے، ہم (مسلمان) اس کو نہیں کھاتے۔'' یہودیوں نے اس حق پرستی کا مشاہدہ کیا تو بے اختیار بولے کہ ''یہی وہ انصاف ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہیں۔'' (موطا امام مالک، کتاب المساقاۃ)

اس بارے میں یقیناً کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے کہ حق کو ناحق بنا دینے یا ناحق کو حق بنا دینے کے لئے جو مال یا کوئی چیز دی جائے وہ رشوت کہلاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہم سب اس لعنت کو نہ صرف اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ کسی نہ کسی سطح پر اس کا حصہ دار بھی بن جاتے ہیں۔ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی سے لے کر حج کے لیے جلد پاسپورٹ کے حصول تک ہر جگہ رشوت کا لین دین ہمارے سسٹم کا حصہ بن گیا ہے۔

اسلام نے رشوت کی جملہ صورتوں کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے، رشوت دینے اور لینے والے کو سخت عذاب کی وعید سنائی ہے۔ ابن حبان اور ترمذی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد

منقول ہے کہ فیصلہ کرنے کے سلسلے میں رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ نے لعنت فرمائی ہے۔

بد قسمتی سے اس واضح شرعی حکم کے باوجود آج ہمارے معاشرے میں کرپشن کی وباء بالکل عام ہوتی جارہی ہے۔رشوت کی کئی صورتیں آج ہمارے درمیان رائج ہو چکی ہیں جسے برائی بھی نہیں سمجھا جاتا۔رشوت کی وہ عام صورتیں مندرجہ ذیل ہیں جن میں سے بعض صورتیں ایسی ہیں کہ انھیں ہم رشوت کے ضمرے میں شمار ہی نہیں کرتے۔

- کسی اعلی منصب کے حصول کے لئے یا نوکری کے حصول کے لئے رشوت دینا۔اس رشوت کے نتیجے میں اس منصب کے اہل کا حق تلف ہو جاتا ہے جو کہ بہت بڑا گناہ ہے۔
- جج یا پولیس افسر وغیرہ کو کچھ دیا جائے تاکہ وہ ہمارے حق میں ہی فیصلہ کرے۔یہ رشوت نہ صرف عدل و مساوات کے خلاف ہے بلکہ باطل کی حمایت کا گناہ بھی ہے۔
- کسی کی زمین پر ناجائز قبضے کے لیے رشوت دے کر جعلی کاغذات بنوانا۔
- سرکاری محکموں میں یہ مرض عام ہے کہ جب تک اہلکار کو رشوت نہ دی جائے وہ کام نہیں کرتے،اسی طرح بعض اہلکاران خاص لوگوں کے کام دیگر افراد سے پہلے کر دیتے ہیں جو انھیں "خرچہ پانی" دیتے ہیں۔یہ بھی رشوت کی ایک شکل ہے۔
- آج کل تعلیمی اداروں میں بھی رشوت کی یہ صورت عام ہے کہ پیسے لے کر نااہل طالب علم کو پاس کر دیتے ہیں،یا اچھے نمبر دے دیتے ہیں۔یہ رشوت کی سب سے بد ترین صورت ہے جس کے اثرات اجتماعی سطح پر ہوتے ہیں۔

قبول حق اور تعصب

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (208) فَإِن زَلَلْتُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنَاتُ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۔(البقرہ209-208 :2)

اے اہل ایمان ! اطاعت الٰہی میں پوری طرح داخل ہو جاؤاور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔اگر تم واضح دلائل کے بعد بھی لغزش کھا گئے تو جان لو کہ اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

بسا اوقات انسان کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے عقائد و نظریات کے گھر کی دوسری جانب حق کی روشنی محسوس ہوتی ہے، وہ تاریکی میں رہتا ہے مگر اس کا دل حق کی طرف مائل ہونے لگتا ہے، اسے اپنی مخالف سمت میں سچائی کا عکس دکھائی دیتا ہے تاہم بعض معاملات میں کچھ ترددا ور خلجان ہوتا ہے جس کی بناء پر وہ اپنے سابقہ نظریات کے اُس محل کو توڑنے کی جسارت نہیں کر پاتا جسے صدیوں سے اس کے بزرگوں نے تعمیر کیا ہو۔ایسے میں جب سامنے حق کھل کر واضح ہو جائے تو یہ ایک اخلاقی امتحان ہوتا ہے کہ اب خدا کا یہ بندہ شرح صدر اور اطمینان کے ساتھ اس کی طرف لپک کر اسے قبول کرتا ہے یا حق واضح اور روشن ہو جانے کے بعد بھی خداوند عالم کے حکم کے خلاف اپنی سرکشی جاری رکھتا ہے؟

ایک غیر متعصب اور بہترین کردار کا حامل انسان وہ ہوتا ہے جس کا ذہن ہمیشہ صحیح بات کو تسلیم کرنے کے لیے راضی رہے، اس کا وجود حق پرستی کا مظہر ہو، اس کا شیوہ یہی ہو کہ وہ کلیتاً خدائے واحد کے سامنے سر تسلیم خم کیے بیٹھا ہو۔ اپنی گذشتہ غلط بات پر وہ خواہ کتنے عرصے سے ،اور وہ نظریہ چاہے کتنی نسلوں سے ہی کیوں قائم نہ ہو۔ صحیح بات تسلیم کرنے میں کتنی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے وہ اسے ضرور تسلیم کرتا ہے۔

قرآن مجید کی ان آیات کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں کہ اگر ہمارے نظریات و خیالات کے خلاف واضح دلائل ہمارے سامنے آجائیں تو ہم بلاتردد اسے قبول کرلیں گے یا زمانے کے خوف یا تعصب کی وجہ سے اسے تسلیم نہیں کریں گے اور دلائل آجانے کے بعد بھی سرکشی کا رویہ اختیار کریں گے ؟ کیا آپ اس بات کے لیے تیار ہیں کہ حق پر استقامت کے خاطر ہر مشکل کا سامنا کریں گے ؟ کیا آپ میں بھی وہ قوت ہے جس کی بناء پر سقراط نے زہر کا پیالہ پی لیا مگر باطل کو تسلیم نہ کیا۔ اہل حکمت کہتے ہیں کہ سقراط کی طبعی موت زہر سے ضرور واقع ہوئی مگر اس کے پیالے میں زہر نہ تھا ورنہ وہ آج زندہ نہ ہوتا۔

انفاق اور ہمارا رویہ

الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِا للّهِ ثُمَّ لاَ يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُواُ مَنًّا وَلاَ أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ . قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَآ أَذًى وَاللّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ۔(البقرة 2: 262-263)

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور (روزِ قیامت) انھیں نہ تو (مستقبل کے) اندیشے لاحق ہوں گے اور نہ ہی (ماضی کے) پچھتاوے۔ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر در گذر کرنا اُس خیرات سے بہتر ہے، جس کے بعد دل آزاری ہو۔اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اُس کی صفت ہے۔

راہِ خداوندی میں اپنا مال خرچ کرنا نوعِ انسانی کے ہاں ایک معروف عمل ہے۔قرآن مجید نے اس عمل کو بہترین عمل قرار دیا ہے لیکن یہاں اس آیت میں جس اہم امر کی طرف اشارہ ہے اس پر ہماری توجہ بالعموم انتہائی کم دی جاتی ہے۔یعنی ہمارا اور سائلین کے مابین رویہ۔

عموماً ہمارے معاشرے میں یہ وباء عام ہے کہ اگر ہمارے سامنے کوئی سائل آئے تو ہم اپنے متعلق

فضیلت و برتری کے احساس میں مبتلاء ہو جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے کوئی بھکاری، معذور یا بالخصوص خواجہ سرا ہوں، ہمارا رویہ ان کے ساتھ انتہائی تضحیک آمیز ہوتا ہے۔ یا ہم انھیں دھتکار دیتے ہیں یا پھر ان کے ساتھ توہین و تمسخر کا وہ سلوک اختیار کرتے ہیں جو شرفِ انسانیت کے خلاف ہے۔ قرآن یہاں اسی رویے کی مذمت کر رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وسیع تناظر میں اس آیت کا اطلاق محض انفاقِ مال نہیں بلکہ ہر اس عمل پر ہوتا ہے جو ہم خدا کے رضا و خوشنودی کے لیے سرانجام دیں۔ اللہ کی راہ میں کوئی عمل محض انجام پذیر ہونے سے ہی معتبر نہیں ہو جاتا بلکہ اسے کچھ اخلاقی اصولوں کے مراحل سے گزرنا ضروری ہے۔ آپ نے کسی کو معاف کر دیا، کسی کے لیے بھلائی کر دی، کسی کے روزگار کا انتظام کر دیا، یا اپنے قول و فعل سے کسی بھی قسم تعاون کیا ہے تو آپ کا یہ عمل صرف اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ کوئی شخص کسی پر احسان کرے، لیکن پھر اسے جہاں بھر میں جتلائے پھرے تو اس عمل کی کوئی قدر و قیمت اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی سائل آپ کے پاس آئے تو آپ پر لازم ہے کہ اس کی مجبوری لوگوں پر فاش نہ کریں۔ ان کی مدد کریں تو انھیں اس بات کا احساس نہ دلائیں کہ آپ ان پر کوئی احسان کر رہے ہیں بلکہ تواضع اور عاجزی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے پیش آئیں اور یہ بات ذہن میں رکھیے کہ آپ کوئی احسان نہیں بلکہ اپنی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ مبادا کہ اِحسان جتلا کر ذہنی اذیت دینے سے ثواب کے بجائے اللہ کی ناراضی کا مستحق ہو۔

بالفرض اگر آپ مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو انھیں احسن انداز سے سمجھا دیجیے۔ راہِ

خداوندی میں محض مادی سرمایہ خرچ کرنا ہی بڑا عمل نہیں بلکہ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر درگذر کر دینا اُس خیرات سے بہتر ہے، جس کے بعد احسان جتلا کر اسے اذیت دی جائے۔ مسلم کی حدیث کے مطابق اللہ رب العزت روزِ قیامت اس شخص کی طرف نگاہ کرم نہیں کریں جو نیکی کر کے احسان جتلاتا ہو۔اسی طرح کسی ناگوار بات کو در گزر کر دینا، مثلاً کوئی ہمیں طعنہ دے یا ہمارے ساتھ سختی سے پیش آئے تو ہمیں اسے معاف کر کے بھول جانا صدقے سے بہتر ہے۔

اعترافِ بندگی

رَبَّنَا لاَ تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلاَ تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلاَ تُحَمِّلْنَا مَا لاَ طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَآ أَنتَ مَوْلاَنَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۔(البقرة286 :2)

اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا خطا کر بیٹھیں تو ہماری گرفت نہ فرما۔ اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر اتنا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر اتنا بوجھ (بھی) نہ ڈال جسے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں، اور ہمارے (گناہوں) سے در گزر فرما، اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا کارساز ہے پس ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما۔

یہ آیات قرآن مجید کی بہترین دعاؤں میں سے ہیں جن میں انسان کی عاجزی، کمزوری اور خشیت کا اظہار ہے۔ایک صاحبِ تفسیر فرماتے ہیں کہ جب دینے والا خود ہی مانگنے کا ڈھنگ بتائے تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے۔یہ دعا مومنین اور ان کے رب کے مابین تعلق کی انتہائی واضح تصویر ہے۔سورۃ البقرہ کی ان آخری آیات میں یہ دعا ہے کہ:

اے ہمارے رب! تیری اطاعت میں ہم سے جو کچھ بھول چوک اور کوتاہیاں ہوں، یقیناً وہ قابل

سزا ہیں مگر تو محض اپنے رحم و کرم سے انھیں معاف فرمانا، ان پر ہماری گرفت نہ کرنا۔ مالک! ہم کمزور و ناتواں ہیں ہم پر ذمہ داریوں کا اس قدر بوجھ نہ ڈالنا جس طرح پچھلی امتوں پر ان کی سرکشی کے سبب ڈالا گیا۔ جن ابتلاؤں سے وہ گزرے ہیں ہمیں ان سے محفوظ رکھنا۔

ہم تیری اطاعت کی بھرپور سعی کرتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ تیری راہ میں خوف، بھوک اور قلتِ اموال کی آزمائش بھی آتی ہیں۔ اے رب العٰلمین! ہمیں کسی ایسی آزمائش میں مبتلاء نہ کرنا جسے ہم اپنی کم ہمتی کے باعث برداشت نہ کر سکیں۔ ہم اقرار کرتے ہیں کہ ہم تیرے وفادار ہیں مگر اے مالک! ہماری وفاداری کا کڑا امتحان نہ لینا کہ ہم ناکام ہو جائیں، ہم راہِ حق سے پھسل جائیں۔

وَاعْفُ عَنَّا ہمیں معاف فرما، ہمارے ساتھ نرمی والا معاملہ کر۔ **وَاغْفِرْ لَنَا** ہماری مغفرت فرما، ہمارے گناہوں کی پردہ پوشی کر، ہمیں اپنی رحمت میں ڈھانپ لے! **وَارْحَمْنَآ** ہمارے نفوس لغزشوں کا شکار ہو جاتے ہیں، تو ہم پر رحم فرما! یقیناً ایک تُو ہی ہمارا مولیٰ ہے! ہمارا ولی و مددگار ہے۔ پس ہمیں حق کا انکار کرنے والوں پر غلبہ عطا فرما! آمین